ہفت روزہ
الفتح
کراچی
۷-۱۴ جون ۱۹۷۳ء

جون کے
شہیدوں کو سلام



پچھلے ہفتے مرکزی حکومت نے الفتح کا نیوز پرنٹ کوٹہ مکمل طور پر منسوخ کر دیا۔ اس جبری اقدام کے خلاف ملک کی متعدد شخصیتوں نے احتجاج کیا۔ روزنامہ امن، ڈان، حریت اور جسارت نے اداریے لکھے، اور متعدد مزدور تنظیموں نے بیانات کے ذریعے ہماری حمایت کا اظہار کیا۔ ادارہ اس پُرخلوص جذبے پر ان تمام افراد اور اداروں کا شکریہ ادا کرتا ہے اور اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ ہم ان انتقامی اور جبری کارروائیوں سے مرعوب نہیں ہونگے اور ان مشکلات میں بھی پوری دیانتداری سے عوام کے مسائل کی ترجمانی کرتے رہیں گے۔

ہفت روزہ الفتح سے مظلوم طبقات کی حمایت کا انتقام لیا جا رہا ہے

سندھ صوبائی اسمبلی کے رکن اور سابق گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور نے ہفت روزہ الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ اور سرکاری اشتہارات بند کرنے کی شدید مذمت کی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ الفتح نے ہمیشہ استحصالی طبقوں کے خلاف آواز بلند کی ہے اور اصولوں پر اس جریدہ نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔

متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ نے اخبار الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ منسوخ کرنے پر تشویش کا اظہار کیا ہے، اور کہا ہے کہ حکومت کے اس اقدام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الفتح کی اشاعت بند کرنا چاہتی ہے۔ عثمان بلوچ نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ الفتح کا کوٹہ بحال کیا جائے۔

یونین آف کمرشل آرٹسٹ کے جنرل سیکرٹری حفیظ مرزا نے کہا ہے کہ الفتح نے پیپلز پارٹی کے منشور کو عوام تک پہنچانے کے لئے بہت کام کیا ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ الفتح کے سرکاری اشتہارات اور نیوز پرنٹ کا کوٹہ بحال کرے۔

کنزی یونین آف جرنلسٹ کے ایک اجلاس میں الفتح کا نیوز پرنٹ کا کوٹہ منسوخ کرنے پر شدید احتجاج کیا گیا ہے۔ اور صدر بھٹو سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ عوام کے بیباک ترجمان الفتح کے ساتھ ہونیوالے ظلم کے خلاف مداخلت کریں۔

پاکستان انشورنس ایمپلائز یونین نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ کئی اخبار میں کچھ لوگ سیاسی رشوت وصول کرتے ہیں اور ہماری خبروں کا بلیک آؤٹ کرتے ہیں۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اس قسم کی کارروائی اگر آئندہ کی گئی تو ہم اس کا نام بمعہ ثبوت فراہم کریں گے اور ان کو عوام کے سامنے لائیں گے۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

مدیر
وہاب صدیقی

۷ - ۱۴ جون ۱۹۷۳ء
قیمت : —— ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد : ۴ شمارہ : ۴

خاص مضامین

سرورق : مہر افروز
عکاس : گرینگو
فون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

ہم اپنا جشن نہیں کریں گے

ہم نے تین سال پہلے الفتح کا آغاز کیا تھا۔ ہم اس کے ذریعے رجعت پسندوں کے قلعے میں شگاف ڈالنا چاہتے تھے۔ ہمارے وسائل بہت محدود تھے، لیکن ہمارے جذبے لامحدود تھے۔ ہم بے سرو سامان تھے، لیکن لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ کراچی سے لے کر ہُنزہ تک، پاکستان کے تمام مظلوم عوام الفتح کی آواز میں کشش محسوس کرنے لگے۔ ہم کمزور تھے، ان مظلوموں نے ہمارے ہاتھ مضبوط کئے۔ اور جب ایک بار ہمیں ننگے بھوکے عوام کی حمایت حاصل ہوگئی تو ہم میں پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم پیدا ہوگیا۔

ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور میں نوکر شاہی نے دائیں بازو کے رجعت پسندوں کے ساتھ مل کر ہماری آواز کا گلا گھونٹنا چاہا۔ ہم پر کُفر کے فتوے لگائے گئے۔ لیکن ہم اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے۔ شیر علی، وزیر اطلاعات نے ہمیں پابندیوں کے حصار میں لینا چاہا، لیکن وہ ہماری بے باکی کو نہیں خرید سکا — پاکستان کے عوام ایک آواز ہوکر اس گلے سڑے نظام کے خلاف آواز بلند کررہے تھے، ہم ان سے غداری نہیں کرسکتے تھے۔ ہمیں ملٹری کورٹ میں طلب کرکے ہراساں کیا گیا، لیکن ہم اس مرتے ہوئے نظام کے ایجنٹوں سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ہم حق

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا پی۔ ای سی۔ ایچ۔ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا۔

بات سرِ دار کہنے کا جذبہ رکھتے تھے، اس لئے ہر آزمائش میں پورے اُترے۔

اُس وقت ہم ان لوگوں کے ساتھ تھے، جو آج اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ انہوں نے عوام کو خوشنما نعرے دیئے تھے، ان سے وعدہ کیا تھا کہ موجودہ استحصالی نظام کو تبدیل کر دیا جائے گا۔ وہ بڑے بڑے جلسوں میں ہمارے گُن گایا کرتے تھے۔ ہمیں ان سے کوئی لالچ نہیں تھا۔ ہمیں تو بس یہ معلوم تھا کہ ان کا منشور انسان کی صدیوں پرانی آرزوؤں کی جھلک پیش کر رہا تھا۔ ہم اس ظلم و جبر کے نظام سے نفرت کرتے تھے، اس لئے ہم نے کُھل کر ان کا ساتھ دیا۔ ہم نے مل کر، ایک دوسرے کے کاندھے سے کاندھا ملا کر دائیں بازو کے رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا، اور انہیں شکستِ فاش دی۔

لیکن جب یہ لوگ برسرِ اقتدار آئے تو ان کے وعدے ہوا میں بکھر گئے۔ ان کے لہجے سے منافقت کی بُو آنے لگی۔ وہ دائیں بازو کے رجعت پسندوں اور ایجنٹوں سے گٹھ جوڑ کرنے لگے، جن کے خلاف جذبات اُبھار کر انہوں نے عوام میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ یہ ان کے فطری اتحادی تھے، انہیں بہر حال اسی طرف جانا تھا، ہمارے نظریات منافقت اور مکاری سے کوسوں دور تھے، اس لئے ہم اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ہم سخن فہم بننا چاہتے تھے، ہمیں غالب کی "طرفداری" قبول نہیں تھی۔ ہم ان لوگوں کی طرح ضمیر فروش نہیں تھے، کہ اپنے وعدوں سے پھر جاتے۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، اُسے بیان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ہم میں کھوٹے سکوں کی طرح ظاہری چمک دمک نہیں ہے۔ ہمارے دلوں میں عوام سے سچی محبت کا جذبہ موجزن ہے۔

جب یہ لوگ، جو ایک زمانے میں ہمارے ساتھ تھے، دشمنوں کی صف میں کھڑے ہو گئے تو ہم نے ان کو بے نقاب کرنا اپنا فرض سمجھا۔ عوام نے ہمیں جس قلم کا محافظ بنایا تھا، ہم اس کی حرمت پر کوئی آنچ نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ اگر ہم بھی بے غیرت ہوتے، تو ہماری آواز کو بھی سونے کی ترازو میں تولا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے لئے وہ خار دار راہ منتخب کی جس پر چلنے والے کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں۔ ہم نے نرم صوفوں کا سودا نہیں کیا۔ نرم صوفے تو ان کے مقدر میں تھے، جنہوں نے انہی مظلوم عوام کے لہو سے اپنے چہروں کو چمکایا ہے، جن کی مظلومیت کا وہ اٹھتے بیٹھتے رونا روتے تھے۔

وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی زبانوں پر بڑے بڑے تالے لٹکا دیں۔ وہ ظلم بھی کرنا چاہتے ہیں اور ظلم سہنے والے کو فریاد کی اجازت بھی دینا نہیں چاہتے۔ انہیں اپنی مادی قوت پر گھمنڈ ہے، ہم اپنے جذبوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہوں نے مزدوروں پر گولیاں چلائیں، ہم نے ان کے خلاف لکھا۔ انہوں نے غریب ہاریوں کے حقوق سلب کر کے وڈیروں کے ہاتھ مضبوط کئے، ہم نے ان کی مذمت کی۔ انہوں نے نوکر شاہی کو چھوٹ دی، ہم نے ان کے خلاف اپنے قلم سے جہاد کیا۔ انہوں نے گھسے پٹے سیاست دانوں کو گلے لگایا، ہم نے ان کو بے نقاب کیا۔ ہمیں ان کے قہر سے کوئی ڈر نہیں تھا، ہمیں عوام کا کرم حاصل تھا۔ ہماری دیانتداری اور خلوص پر وہ لوگ انگلیاں نہیں اٹھا سکتے، جو روز بروز زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ عوام کی نظروں میں گرتے جا رہے ہیں۔

ہمارے خلاف متعدد "احتسابی" اقدامات کئے گئے۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم ڈر کر کونوں میں دُبک جائیں گے۔ لیکن ان کے اندازے غلط نکلے، کیونکہ وہ غلط اندازے قائم کرنے میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ ترقی پسندی کا دعویٰ کرنے والے رجعت پسندی کی رنگین عینکیں لگائے بیٹھے ہیں۔ بازی ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ جو عوام کل تک ان کے گیت گاتے تھے، آج اُن سے بیزار نظر آتے ہیں۔ زمین ان کے قدموں کے نیچے سے سرک رہی ہے۔ لیکن وہ اب بھی دلفریب خوابوں کی سرزمین سجائے بیٹھے ہیں۔ جیلیں قیدیوں سے بھری پڑی ہیں۔ مہنگائی کا بھوت اپنے بدنما دانت نکالے عوام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہر طرف مایوسی اور بددلی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ جمہوری اقدار کو انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ پامال کیا جا رہا ہے۔ بلوچستان میں اکثریتی پارٹی کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا ہے۔ وزراء بدعنوانیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان حالات میں جب ہم نے کُھل کر احتجاج کیا تو ہمارا گلا گھونٹنے کے لئے ہمارے خلاف پابندیاں لگائی گئیں۔ اب ہمارا نیوز پرنٹ کا کوٹہ مکمل طور پر بند کیا جا چکا ہے۔ حالات ہمارے لئے زیادہ مشکل ہو گئے ہیں، لیکن ہمارے جذبے بلند، بہت بلند ہیں۔ ہم ان ہتھکنڈوں سے مرعوب ہو کر ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ ہمیں آج تک مات نہیں ہوئی، ہم صدیوں سے ظلم کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہم فاتح ہیں، کیونکہ عوام آج بھی ہمارے ساتھ ہیں، اور ہم آج بھی پوری دیانتداری سے عوام کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ شکست کھا چکے ہیں، کیونکہ آج عوام اُن سے تنگ آ چکے ہیں اور آج وہ عوام کے حقوق کو سرِ بازار نیلام کر رہے ہیں۔ اگر حق گوئی جرم ہے تو ہم اس جرم کو بار بار گلے لگائیں گے۔

اگر ہمارے سامنے محدود مفادات ہوتے تو ہم بھی اپنے اصولوں کا سودا کر چکے ہوتے۔ لیکن ہمارا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ ہمارے سامنے لاکھوں بے بس و بے کس انسان ہیں۔ اُنکی حمایت ہی تو ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہم اس سرمائے کی ہر قیمت پر حفاظت کریں گے۔

واقف حال

آگ کے اِس کھیل میں جسم جل جائے گا

سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ، ریڈیو ٹیلی ویژن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے مطابق "بلوچستان میں حالات معمول پر آگئے ہیں۔ عوام فوج سے تعاون کر رہے ہیں۔ مری قبائل کے تین سرداروں، میر قیصر خان گزنی مری، وڈیرہ محمد خان لوہرانی مری اور میر فتح خان بجرانی مری نے خود کو صوبائی حکومت کے حوالے کر دیا ہے۔ اور مری قبائل کی دو تہائی اکثریت نیشنل عوامی پارٹی کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔" ان خبروں کو پڑھ کر ۱۹۷۱ء کا زمانہ یاد آتا ہے، جب یحییٰ خان کے حکم پر مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی۔ اس زمانے میں سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ اور سرمایہ داروں کے اخبارات نے مغربی پاکستان کے عوام کو ایسی ہی خوشخبریاں سنائی تھیں۔ شب و روز یہی کہا جاتا تھا کہ "مشرقی پاکستان میں حالات معمول پر آگئے ہیں۔ عوام فوج سے تعاون کر رہے ہیں۔ آج فلاں رہنما نے پاکستان سے وفاداری کا اعلان کر دیا اور یہ اتنے ہزار افراد کی نمائندگی کرتا ہے۔" اخبارات اور ٹیلی ویژن سقوطِ ڈھاکہ سے ایک دن قبل تک یہی راگ الاپتے رہے۔ ریڈیو پاکستان تو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی دوپہر تک ایسی ہی خوش خبریاں سناتا رہا۔ مغربی پاکستان کے عوام کو حقیقی صورتحال کا علم اس وقت ہوا جب ریڈیو پاکستان نے دو جملوں میں ڈھاکہ میں بھارتی افواج کے داخلے اور مشرقی حصہ میں جنگ بندی کی خبر نشر کی۔ تب عوام نے جانا کہ ہم تو آل انڈیا ریڈیو کو دنیا کا سب سے زیادہ جھوٹا ادارہ سمجھتے تھے لیکن پاکستانی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اس کا بھی ریکارڈ توڑ دیا۔ اعتماد سے محروم پریس میں بلوچستان کے بارے میں ایسی خبریں پڑھ کر عوام سوچنے پر مجبور ہیں کہ کہیں دوسرے عظیم المیئے کی تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں۔

بلوچستان میں بحران کیوں پیدا کیا گیا؟ اسکا سیدھا سادہ اور دو ٹوک جواب یہ ہے کہ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء سے حالات اور واقعات کی نوعیت اور ان کے تسلسل کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی، مغربی پاکستان



سرکاری گواہ بنے تو
بلوچستان کی گورنری
بخش دی گئی

کے ہر صوبے میں خواہ وہاں اس کی اکثریت ہو یا نہ ہو اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے مارشل لاء کے تحت صدارتی اختیارات سنبھالے انہوں نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں گورنر مقرر کئے۔ ان چاروں گورنروں کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے تھا حالانکہ روایت یہ ہے کہ ہمیشہ "نان پارٹی مین" کو گورنر بنایا جاتا ہے۔ لیکن مسٹر بھٹو نے اس روایت پر عمل نہیں کیا۔ اگر وہ ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے کہ جس میں گورنر "پارٹی مین" ہو، تو انہیں چاہیئے تھا کہ وہ سرحد میں نیپ یا جمعیت علمائے اسلام اور بلوچستان میں نیپ کے کسی رہنما کو گورنر بناتے، کیونکہ سندھ اور پنجاب میں اکثریتی جماعت کا رہنما گورنر بنایا گیا تو یہ حق سرحد اور بلوچستان کی اکثریتی جماعتوں کو کیوں نہیں دیا گیا۔

پھر ایک معاہدہ کے تحت سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنروں کا تقرر کیا گیا اور اکثریتی جماعتوں نے حکومتیں بنائیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ مرکزی حکومت بلوچستان اور سرحد میں عوام کی منتخب شدہ حکومتوں کی سرپرستی کرتی اور عوامی مسائل حل کرانے کے لئے ان کی مدد کرتی۔ لیکن مرکزی حکومت اور اس کے وزیرِ داخلہ قیوم خان نے نیپ کے خلاف محاذ کھول دیا۔ سرکاری ذرائع ابلاغِ عامہ کو، جس کے اخراجات عوام پر ٹیکس لگا کر پورے کئے جاتے ہیں، اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کیا گیا۔ سرکاری اثر و رسوخ، اقتصادی دباؤ، لالچ اور ظلم و تشدد کے ذریعے بلوچستان اور سرحد کی اکثریتی جماعتوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے لئے مذموم اور غیر قانونی حربے استعمال کئے گئے۔ کہا گیا کہ بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں کی سرپرستی میں اسمگلنگ ہو رہی ہے۔ لیکن یہ الزام لگاتے وقت مرکزی حکومت یہ بھول گئی کہ اسمگلنگ سندھ اور پنجاب میں بھی ہو رہی ہے۔ بلوچستان میں اسمگلنگ کے واقعات کو محکوم پریس کے ذریعے اچھالا گیا۔ جب اس پر بھی بات نہ بنی تو غیر ملکی اسلحہ اور "گوریلوں" کا ہوّا کھڑا کیا گیا۔ مرکزی وزارتِ اطلاعات و نشریات کی ہدایت پر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے ذریعے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ "بلوچستان میں غیر ملکی اسلحہ آرہا ہے، بلوچ عوام کو گوریلا تربیت دی جارہی ہے، نیپ بلوچستان کو پاکستان

سے علیحدہ کرنا چاہتی ہے۔" بلوچستان میں مینگل وزارت کو توڑنے کے لئے مرکزی حکومت نے قبائلی تضادات سے فائدہ اٹھایا۔ اکبر بگٹی سے مل کر مینگل کابینہ کے خلاف محاذ بنایا گیا۔ اکبر بگٹی جنہیں مرکزی حکومت اور سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ "غدار"، "لندن پلان کا خالق" "غیر ملکی ایجنٹ" اور عجب کا دستِ



شیر محمد مری پر سرکار کا جادو نہ چل سکا

راست" کے القاب سے نوازتی تھی۔ لندن سے بلوایا گیا اور نیپ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا۔ اسطرح اکبر بگٹی راتوں رات "محافظِ پاکستان" اور "عظیم محبِ وطن رہنما" بنا دیئے گئے۔

اس کے بعد عراقی سفارت خانے سے برآمد ہونے والے روسی اسلحہ کا اسکینڈل کھڑا کیا گیا۔ مرکزی حکومت نے الزام لگایا کہ یہ اسلحہ نیپ کے لئے آیا تھا اور وہ اسے بلوچستان کے علیحدگی پسندوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بلوچستان کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں۔ نیپ اسلحہ اس راستے سے بھی منگوا سکتی تھی۔ کیا وجہ ہے کہ اس نے بغداد سے کراچی، کراچی سے اسلام آباد اور اسلام آباد سے کوئٹہ کا راستہ اختیار کیا۔ مرکزی حکومت کو چاہیئے تھا کہ وہ اس نقطہ پر غور کرتی، لیکن اس نے اس واقعہ سے سیاسی فائدہ اٹھایا اور اس بہانے مینگل کابینہ کو برطرف کر کے گورنر راج قائم کر دیا۔ سرحد میں مفتی کابینہ نے احتجاجاً استعفےٰ دیدیا۔ مری قبائل کے محبِ وطن عوام کو بدنام کرنے کیلئے مرکزی حکومت نے شیر محمد مری کو اس الزام کے تحت گرفتار کر لیا گیا کہ وہ بیس ہزار گوریلا فورس کے کمانڈر ہیں۔ اور یہ کہ وہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ گرفتاری کے وقت اپنے "کوڈ" میں اپنے گھر پر موجود تھے۔

مرکزی حکومت نے عوام کو متاثر کرنے کے لئے شیر محمد مری کے خلاف مذموم پروپیگنڈہ کیا۔ لیکن اندرونِ خانہ انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ شیر محمد مری نے اپنے حلف نامہ میں بتایا ہے کہ لاک اپ میں صدر بھٹو کے خاص ایلچی نے ان سے ملاقات کی اور کہا کہ اکبر بگٹی ولی خان، غفار خان، بزنجو اور مینگل کے خلاف بیانات دیکر سرکاری گواہ بن گیا تو اسے بلوچستان کی گورنری بخش دی گئی۔ اگر تم بھی نیپ کے رہنماؤں کے خلاف یہ بیان دے دو کہ وہ بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنا چاہتے ہیں تو تمہیں اکبر بگٹی سے زیادہ نوازا جائے گا۔ شیر محمد مری سے معراج محمد خان کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ اور ان سے ایسا بیان دلوانے کی کوشش کی گئی کہ جس سے عراقی اسلحہ کا تعلق معراج محمد خان سے ہو سکے۔ ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرکزی حکومت اپنے مکروہ منصوبوں کی تکمیل کے لئے کیسے کیسے اوچھے حربے استعمال کر رہی ہے۔

مرکزی حکومت کا خیال تھا کہ مینگل کابینہ کی برطرفی اور اکبر بگٹی کی گورنر کی حیثیت سے تقرری کے بعد بلوچستان اسمبلی میں نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام اعتماد سے محروم ہو جائے گی۔ ارکان اسمبلی کی اکثریت اپنی لاتعلقی کا اظہار کر دے گی۔ اکبر بگٹی نے صدر راج کے دوران ارکانِ اسمبلی کو توڑنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر کار مجبوراً انہیں جام صاحب آف لس بیلہ کو کابینہ بنانے کی دعوت دینی پڑی، جن کو صرف ۹ ارکانِ اسمبلی کی حمایت حاصل ہے۔ مرکزی حکومت کا خیال تھا کہ کابینہ کے قیام کے اعلان کے بعد ارکانِ اسمبلی نیپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ دوسری جانب نیپ نے اسمبلی کا اجلاس بلوانے کا مطالبہ کیا۔ بجٹ سیشن کا وقت بھی آ رہا تھا۔ اکبر بگٹی، جام صاحب اور مرکزی حکومت جانتی تھی کہ موجودہ کابینہ پر عدمِ اعتماد کا ووٹ منظور ہو جائے گا۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بلوچستان میں فوجی کارروائی شروع کر دی۔

بلوچ عوام میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ یہاں تک کہ کوئٹہ پیپلز پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے احتجاجاً اپنی پارٹی سے استعفےٰ دیدیا۔ بلوچستان کے حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ مری قبائل کو راشن کی سپلائی روک دی گئی ہے۔ اس ظلم و تشدد کا کیا نتیجہ ہو گا۔ یہ نہ صرف مرکزی حکومت کے سوچنے کی بات ہے۔ بلکہ عوام کے لئے بھی دعوتِ فکر ہے۔ سندھ، پنجاب اور سرحد کے عوام کو چاہیئے کہ وہ مرکزی حکومت کے غیر قانونی اقدام کی مذمت کریں۔ اور مطالبہ کریں کہ فوجی کارروائی فوراً بند کی جائے۔

بلوچستان میں فوجی کارروائی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ امریکی سامراج کے اشارے پر ایران اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین جن سیاسی مقاصد اور جنگی عزائم کے لئے اشتراک اور تعاون کی ابتداء ہوئی ہے۔ بلوچ عوام اس کے شدید مخالف ہیں۔ دراصل یہ سب تیل کی سیاست کے کرشمے ہیں۔ امریکی سامراج ایران اور اسرائیل کی وساطت سے مشرقِ وسطیٰ، خلیج فارس اور بلوچستان کے تیل کے ذخائر پر اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے شاہِ ایران نے خلیج فارس کے دفاع کی ذمہ داری خود سنبھال لی ہے۔ اور اربوں ڈالر فوجی ساز و سامان اور اسلحہ کی خریداری پر خرچ کر رہے ہیں۔ شاہِ ایران نے بلوچستان میں اپنی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا تو بلوچ عوام میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا جس کو دبانے کے لئے فوجی کارروائی کی گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صدر بھٹو نے کیہان انٹرنیشنل کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا: "جو بھی ایران اور پاکستان کے تعلقات اور دوستی کو بگاڑنے کی کوشش کرے گا، میں اسے سختی سے کچل دوں گا۔"



میر عبدالقیوم

جیل سے رہا ہونے والے کشمیری لیڈروں سے خصوصی ملاقات

اشرف کے دستی بم نے کشمیر کو ایک نئے رنگ سے روشناس کرایا

نمائندہ الفتح

سردار قیوم تحریک آزادی کا سب سے بڑا غدار ہے

"کشمیری بزدل ہیں!"

"کشمیری غلامی پسند کرتے ہیں!!"

میں آئے دن اس قسم کے جملے سنتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ احساس میرے دل میں بھی جاگا ہو کہ کشمیری اپنی آزادی کے لئے عمل کرنے کے جذبے سے محروم ہیں۔ بہت سے لوگ اسی انداز میں سوچتے تھے۔ ان کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ انہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کشمیر کی تحریکِ آزادی کے ارتقائی مراحل سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ پھر سچ پوچھا جائے، تو اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ کشمیری لیڈر دھڑے بندی کی سیاست میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی ایسی بھرپور علامت پیش نہیں کی تھی، جو پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر اپنے وجود کا احساس دلا سکتی۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی تحریکاتِ آزادی کا رنگ ہی اور تھا۔ ان کا ہر قدم منزل کو اپنے قریب لا رہا تھا۔ کشمیری عوام کی جدوجہد تو الجیریا کی جدوجہدِ آزادی سے بھی پرانی ہے۔ "پھر آخر اس کے چہرے پر مایوسی، بددلی اور بے عملی کا اندھیر کیوں چھایا ہوا ہے"؟ یہ سوال اگر لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھا، تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جو قوت وقت کی دہلیز پر خود اپنے وجود کا نقش ثبت نہیں کر سکتی، اس کی زندگی کے صفحات کورے رہتے ہیں۔

کشمیری لیڈر کچھ نہ کچھ کر تو رہے تھے، لیکن اس کے نتائج وقتی اہمیت کے حامل تھے۔ شاید وہ اپنی صحیح سمت کی تلاش میں چاروں طرف بھٹکتے پھر رہے تھے۔

شاید کبھی میں نے یوں ہی سوچا ہو۔ لیکن ایک دن میں چونک پڑا۔ ساری دنیا چونک پڑی۔

"بھارتی طیارے، گنگا کا اغوا"، بظاہر یہ خبر بڑی مختصر



میر عبدالمنان

تھی۔ لیکن جب اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کشمیر کا نوجوان، اشرف گنگا کی کھڑکی سے سر باہر نکالے، اپنے جذبوں میں پہاڑوں کا عزم لے کر ساری دنیا کو چیلنج کر رہا ہو— "تمہیں میرے وجود کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ میں نے صحیح سمت کا نشان معلوم کر لیا ہے"۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ اشرف کا چہرہ نہیں تھا۔ پھر یہ کون تھا؟ اس چہرے کو میں نے بار بار دیکھا ہے۔ تاریخ کے ہر صفحے پر اس کے اٹل جذبوں کی داستان رقم ہے۔ یہ چہرہ مجھے کبھی سائیگان میں نظر آیا، کبھی یروشلم میں، کبھی پیونگ یانگ میں، کبھی اسٹالن گراڈ میں، کبھی نانکنگ میں، کبھی انگولا میں، کبھی میڈرڈ میں، کبھی لیبیا میں — یہ اشرف نہیں تھا۔ یہ وہ انسان تھا، جو صدیوں سے ظالموں کے چہروں پر کالک ملتا آیا ہے۔ یہ وہ جذبہ تھا، جو اپنے آگے پہاڑوں کو جھکاتا رہا ہے۔ یہ وہ آواز تھی جو زنجیروں کو لمحے بھر میں پگھلا دیتی ہے۔

یہ اشرف نہیں تھا، کشمیر کی آزادی کا پہلا پیغام تھا۔

اور اس دن میں نے اپنے ذہن سے تمام شبہات کو جھٹک کر دور پھینک دیا۔ اس دن مجھے پہلی بار اس بات کا

"گنگا کو جلانے کے لئے پولیس افسروں نے ماچس فراہم کی



اشرف قریشی

احساس ہوا کہ کشمیری عوام کی جدوجہد تجربے کی بھٹی سے نکل کر ایک واضح شکل اختیار کر رہی ہے۔ اندھیرے کی لمبی سرنگ میں سے نکل کر روشن میدانوں کا رُخ کر رہی ہے۔

اشرف کا دستی بم کشمیر کو ایک نئے رنگ سے روشناس کرا رہا تھا ——

اب کسے یہ کہنے کی جرأت ہوگی کہ "کشمیری بزدل ہیں"؟

میں گنگا اغوا کیس کے تمام واقعات پڑھتا رہا۔ پھر ایک روز میں نے سنا کہ گنگا اغوا کیس کے "ملزموں" پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ کیا یہ سچ ہے۔ کیا یہ دونوں نوجوان بھارت کے جاسوس ہیں؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

اشرف اور اس کے ساتھی ہاشم قریشی، میر عبدالقیوم، جی۔ ایم لون اور میر عبدالمنان تنگ و تاریک کوٹھریوں میں محبوس کر دیئے گئے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں تھا۔ آزادی کے متوالوں کو سلاخوں کے پیچھے قید کرنے والوں کی منطق یہی ہے۔ لیکن جنگ میں ہارنے والوں کو کبھی مات نہیں ہو سکتی۔ دو سال ایک ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ عدالت نے ہاشم قریشی کے علاوہ دوسرے تمام ملزموں کو محبِ وطن قرار دیا۔ ہاشم قریشی کو انیس سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

گزشتہ دنوں کشمیر کے یہ جیالے سپاہی لاہور سے کراچی آئے تو مجھے ان سے ملنے کا موقع ملا۔ ہم سب ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ سنجیدہ طبع میر عبدالقیوم، جن پر لاہور کے قلعے میں بے پناہ اذیتیں توڑی گئیں۔ میر عبدالمنان، جو بڑے تحمل کے ساتھ مجھے کشمیر کی جدوجہدِ آزادی کا پس منظر بتا رہے تھے۔ جی ایم لون جو انتہائی ذہانت کے ساتھ، جوشیلے انداز میں اپنی تحریک کا رخ متعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور اشرف قریشی جو ایک طرف خاموش بیٹھا ہوا غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے اشرف قریشی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اس پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں محبت اور خلوص کے جذبے جھلک رہے تھے۔ میں ان آنکھوں کو برسوں سے پہچانتا ہوں۔ یہ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ کشمیر کا نوجوان دنیا کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ کاندھا ملائے کھڑا تھا، اور اپنی جیت کا اعلان کر رہا تھا۔ اشرف قریشی تاریخ کے صفحات پر بار بار مر کر زندہ ہوا ہے، اور وہ ایک بار پھر میرے سامنے زندہ بیٹھا تھا۔

"آپ قومی محاذِ آزادی کی تشکیل پر کیوں مجبور ہوئے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں میر عبدالمنان نے، جو محاذِ رائے شماری کے جنرل سیکرٹری ہیں، وہ تمام واقعات دہرائے جو میں بار بار سن چکا تھا اور پڑھ چکا تھا، لیکن ان میں ہر بار ایک نئی تازگی نظر آتی تھی۔

حضرت بل کے واقعے کے بعد شیخ عبداللہ نے تمام کشمیریوں سے اپیل کی کہ وہ ہر جگہ محاذِ رائے شماری کے نام سے اپنی تنظیمیں قائم کریں۔ اس اپیل کے جواب میں پاکستان میں رہنے والے کشمیریوں نے پشاور اور سیالکوٹ میں اس تنظیم کی شاخیں قائم کیں۔ کشمیری عوام پاکستانی حکومت کے رویے سے مطمئن نہیں تھے۔ تجربے نے انہیں یہ بتایا تھا کہ وزارتِ امورِ کشمیر نے نوآبادیاتی کردار اختیار کر رکھا ہے۔ چیف سیکرٹری آزاد کشمیر کا اصل حکمران ہوتا تھا۔ پاکستان کی طرف سے کشمیریوں کے حقِ خود اختیاری کا پرچار تو کیا جاتا تھا، لیکن عملی طور پر آزاد کشمیر، وزارتِ امورِ کشمیر کے کلرکوں کے قبضے میں تھا۔ ان حالات میں کشمیریوں کے پاس اسکے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خود اپنی متحدہ تنظیم کے ذریعے بھرپور انداز میں اپنے موقف کی وضاحت کریں۔ اسی دوران ممتاز کشمیری رہنما، غلام عباس نے اعلان کیا کہ وہ شیخ عبداللہ کو اپنا قائد تسلیم کرتے ہیں۔

ان حوصلہ افزا حالات میں پاکستان میں رہنے والے کشمیری تیزی کے ساتھ اتحاد کی ضرورت محسوس کرنے لگے، حالانکہ اس وقت بھی چند مفاد پرست اور رجعت پرست کشمیری ڈیڑھ کی مسجد بنانے پر مصر تھے۔ لیکن وقت انہیں مسترد کر چکا ہے، اور وہ تاریخ کے ملبے پر پڑے کراہ رہے ہیں۔ کشمیری عوام کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ کون لوگ سچے جذبوں کے ساتھ ان کی آزادی کے لئے کام کر رہے ہیں۔

محاذِ رائے شماری کے کارکن سیالکوٹ کی سرحد پر گئے، اور وہاں انہوں نے اپنے وطن کی مٹی ہاتھ میں اٹھا کر یہ عہد کیا کہ وہ کشمیر کی آزادی کے لئے کوئی قربانی دینے سے گریز نہیں کرینگے۔

بھارت میں شاستری برسرِ اقتدار آیا تو شیخ عبداللہ کو ایک بار پھر قید کر دیا گیا۔ ان حالات میں کشمیریوں کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ مفاہمت اور افہام و تفہیم کی راہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہیں۔ محاذِ رائے شماری کی فکر ایک دم تبدیل ہو گئی۔ اسی دوران میر عبدالقیوم، امان اللہ خان میجر امان اللہ اور مقبول بٹ کی ملاقاتیں ہوئیں، اور انہوں

(باقی صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں)



جی۔ ایم۔ لون

غزلیں

شہرِ دل میں لوگ ایسے سکوں باختہ ملے
جن سے ملے وہ بادلِ نخواستہ ملے

کس بے دلی سے ملتے ہیں اک دوسرے سے لوگ
مدت کے بعد جیسے کوئی داشتہ ملے

رستے کی گرد سے مرا چہرہ خراب تھا
لیکن وہ آج بھی مجھے بے ساختہ ملے

میں جن کی ٹھنڈی چھاؤں کو یارو ترس گیا
دل کی زمیں پہ ایسے شجر کاشتہ ملے

کس ضابطے سے مجھ پہ ہوئے لوگ حملہ زن
تھے جتنے زخم جسم پہ آراستہ ملے

کرتا میں کس کو پیش صفائی میں اے سلیم
تھے جتنے روشناس سزا یافتہ ملے

معاذ سلیم سیال

احمد رئیس

ابرِ رواں کی، مست گھٹا کی تلاش ہے
پھر بوئے گل کی، موجِ صبا کی تلاش ہے

پھر ڈھونڈتا ہے دل کسی شہرِ سبا کو آج!
بلقیسِ خوش جمال و ادا کی تلاش ہے

اس عہدِ نامراد میں جینے کے واسطے
جنسِ خلوص و نقدِ وفا کی تلاش ہے

بھر دے جو میری کشتِ تمنا میں رنگ و نور
ایسی حسین مست گھٹا کی تلاش ہے

اپنی ہی ذات سامنے ہے بن کے آئینہ
اپنے ہی خال و خط میں خدا کی تلاش ہے

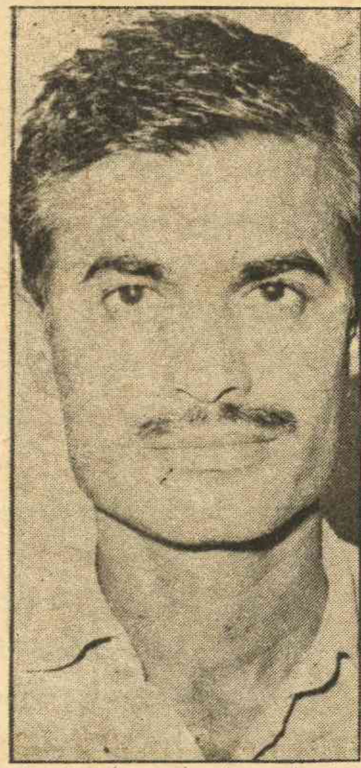
منزل نمائی کون کرے کس کو دیں صدا
مردانِ حق کی، اہلِ وفا کی تلاش ہے

سورج اُگا تو لوگ گھروں سے نکل پڑے
جیسے کہ روشنی کی، صبا کی تلاش ہے

ملکِ سخنوراں میں ہنر خاموش کس لئے
کس انجمن کی، شہرِ نوا کی تلاش ہے

ہم سنگینوں کا حصار توڑ دیں گے





جناب عثمان بلوچ متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر ہیں۔ چند ہفتے قبل ڈی پی آر کے تحت آٹھ ماہ کی طویل نظر بندی کے بعد رہا کئے گئے۔ ۸ جون ۱۹۷۲ء کی تحریک کے دوران ان کی فیڈریشن نے دوسری مزدور تنظیموں کے ساتھ مل کر تاریخی جدوجہد کی اور پہلی بار "پاکستان بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ" کا عملی مظاہرہ کیا۔ جیل سے رہائی کے بعد الفتح کے وہاب صدیقی نے ان سے انٹرویو لیا جو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ سے ایک ملاقات

تحریر
وہاب صدیقی

۷ جون کی تحریک نے پیپلز پارٹی کو بے نقاب کر دیا

سوال: ۷ جون تحریک کی اہمیت کیا ہے؟

جواب: پاکستان کی تاریخ میں ۷ جون کی تحریک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس تحریک میں مزدوروں نے اپنے اتحاد اور سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے علاقائی، صوبائی، نسلی اور لسانی حد بندیاں توڑ دیں، اور ایک اجتماعی قوت سے ابھرے۔ اس سے قبل مزدور اتحاد کا اتنا منظم مظاہرہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ۱۹۷۰ء تک یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی مل کے ایک شعبہ کے مزدور اپنے جائز مطالبات اور مسائل کے حل کیلئے جدوجہد کرتے، تو ان سے اسی مل کے دوسرے مزدور تعاون نہیں کرتے تھے، اگر کسی مل میں ہڑتال ہوتی، اس کے مزدوروں پر فائرنگ کی جاتی، تب بھی اس صنعتی علاقے کی دیگر ملوں کے مزدور انکے لئے آواز نہیں اٹھاتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ فلاں ٹریڈ یونین کا مسئلہ ہے فلاں لیڈر کا مسئلہ ہے۔ ہم خواہ مخواہ اپنی ٹانگ کیوں اڑائیں۔ دشمن نے اس صورت حال سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، اور ایک ایک کرکے مزدوروں کو کچلا۔ تاریخ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ مزدوروں میں سیاسی شعور اجاگر ہوا۔ اور انہیں اتحاد کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ۷ جون ۷۲ء کو مزدوروں نے اپنے اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ دشمن اور درمیانے طبقے کے مزدور قیادت کی پیدا کردہ تمام مصنوعی حد بندیاں توڑ دیں۔ فیروز سلطان انڈسٹریز کی انتظامیہ اور پولیس نے مزدوروں پر فائرنگ کرکے سرمایہ داروں کا حق نمک ادا کیا۔ حکومت کا خیال تھا کہ جس طرح ماضی میں دوسری ملوں کے مزدور لاتعلق رہتے تھے، اسی طرح اب بھی رہیں گے، اور وہ فیروز سلطان انڈسٹریز کے محنت کشوں کو کچل کر رکھ دے گی۔ لیکن دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ فائرنگ کی اطلاع ملتے ہی دوسری ملوں کے مزدور فیروز سلطان انڈسٹریز کے سامنے جمع ہو گئے، اور زیب تن ٹیکسٹائل مز کے مزدور شعیب، پیندار محمد، العظمت سلک ملز کے نیک زادہ، باٹلہ کمپنی کے میاں عمر شاہ، جوبلی اسپننگ ملز کے محمد یار اور دوست محمد کاٹن ملز کے محمد نذیر نے اپنی جانوں کی قربانی دیکر اور سائٹ کی زمین کو اپنے نوجوان اور گرم لہو سے رنگین کرکے مزدور اتحاد کا ثبوت دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ "دنیا کے مزدورو ایک ہو" کا نعرہ ہی نہیں لگاتے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ لانڈھی اور کورنگی کے محنت کش بھی اس ظلم پر تڑپ اٹھے۔ انہوں نے اپنے علاقے کی ملوں کا پہیہ جام کر دیا۔ حیدرآباد اور کوٹری کے مزدور بھی کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ لاہور کے محنت کشوں نے بھی صدائے احتجاج بلند کی۔

حکومت اور بعض مزدور دشمن عناصر نے مزدور اتحاد کو توڑنے، مزدوروں کو آپس میں لڑانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ تمام حربے استعمال کئے۔ ایوب خان کے بھگوڑوں کے ذریعے اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا گیا کہ یہ پٹھانوں کی لڑائی ہے۔ مہاجر، سندھی، پنجابی اور بلوچی کو اس لڑائی میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ پٹھانوں سے کہا گیا کہ یہ سواتیوں کی تحریک ہے، ہزارہ والے کیوں شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن مزدوروں نے ان تمام حربوں کو ناکام بنا دیا۔

۷ جون کی تحریک نے پاکستان پیپلز پارٹی کے طبقاتی کردار کو بے نقاب کر دیا۔ یہ پارٹی "سوشلزم اور جمہوریت" کے نام پر برسر اقتدار آئی تھی۔ اور سرکاری ذرائع ابلاغ عام، ریڈیو ٹیلی ویژن، پریس ٹرسٹ کے اخبارات اور سرمایہ داروں

۷ جون کا میدان ہم نے نہیں دشمن نے منتخب کیا تھا

شہیدوں کے گرم لہو نے محنت کشوں کو متحد کر دیا

کا پریس دن رات پروپیگنڈہ کر رہا تھا کہ "انقلاب کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ ہم سوشلزم کی طرف بڑھ رہے ہیں"۔ اس پروپیگنڈہ کا اثر یہ ہوا کہ ایک عام آدمی پیپلز پارٹی کو حقیقی سوشلسٹ پارٹی سمجھنے لگا۔ لیکن ۷ جون کی تحریک نے اسکے طبقاتی کردار کو بے نقاب کر دیا۔ اور عوام کو معلوم ہو گیا کہ پیپلز پارٹی کا "اسلامی سوشلزم"، جاگیردارانہ سوشلزم ہے، جس کے بارے میں کارل مارکس نے لکھا ہے،

"جاگیردار طبقہ کو اپنے لئے ہمدردی اور حمایت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ بظاہر یہ بھول جائے کہ سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد میں خود اس کا اپنا مفاد شامل ہے اور سرمایہ داری کی مخالفت اس طرح کرے گویا اس سے صرف مظلوم مزدور طبقے کا ہی بھلا مطلوب ہے۔ جب سیاسی عمل کا وقت آتا ہے تو یہ (جاگیردار) مزدور طبقے کو کچلنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور عام زندگی میں اپنے اعلیٰ نظریاتی نعروں کے باوجود، صنعت کے درخت سے گرے ہوئے پھلوں کو لوٹنے کے لئے اوندھے منہ پل پڑتے ہیں۔ جس طرح پیر ہمیشہ زمیندار کا ہم رکاب رہا ہے۔ اس طرح جاگیردارانہ سوشلزم کے ساتھ مذہبی سوشلزم بھی رہا ہے۔"

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ۷ جون کی تحریک نہ ہوتی تو پاکستان پیپلز پارٹی کے طبقاتی کردار کو بے نقاب ہونے میں دو، تین سال لگتے۔ کیونکہ پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد استحصالی طبقوں کے خلاف جو پہلی تحریک چلی، وہ ۷ جون ۱۹۷۲ء کی تحریک ہے۔

۷ جون کی تحریک صرف مزدوروں کے اقتصادی مسائل تک محدود نہیں تھی۔ مزدوروں نے سماجی مسائل بھی پیش کئے۔ انہوں نے مزدور بستیوں کے مسائل پیش کئے۔ صفائی، اسکول اور پلاٹوں کی مستقل الاٹمنٹ کا مطالبہ کیا، مہنگائی ختم کرنے پر زور دیا۔ مزدوروں نے اس تحریک کے دوران درمیانہ طبقے کے شہریوں، چھوٹے دکانداروں اور ملازم پیشہ افراد کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مظلوم طبقات نے ہم سے تعاون کیا۔ حکومت نے درمیانہ طبقے، چھوٹے دکانداروں اور ملازم پیشہ افراد کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ مزدور اُن کی بستیوں کو لوٹ لیں گے۔ جس دن مزدوروں نے مزارِ قائداعظم تک جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا، تو حکومت نے یہ افواہ پورے شہر میں پھیلا دی کہ یہ جلوس دکانوں اور مکانوں کو لوٹے گا۔ جھگڑا اور فساد ہو گا۔ حکومت دراصل عام شہریوں اور مزدوروں کے درمیان نفرت پیدا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن مزدوروں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ جلوس نکالا گیا۔ ہزاروں مزدور اس میں شریک ہوئے، لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ حالانکہ اس جلوس کی قیادت عام مزدور کر رہے تھے۔ اس واقعہ سے مزدوروں کے شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس تحریک میں نئی قیادت اُبھر کر سامنے آئی۔ یہ نئی قیادت ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے، جو انقلابی نظریات سے مسلح ہیں۔ اور جن کی اکثریت مزدور طبقے میں سے ہے۔

سوال: ہر تحریک میں چند خامیاں ہوتی ہیں۔ کیا آپ ۷ جون تحریک کی خامیوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔؟

جواب: ۷ جون کی تحریک کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مزدوروں پر غیر متوقع طور پر حملہ کیا گیا۔ وہ اس کیلئے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ ہم جانتے تھے کہ حکومت اور سرمایہ داروں کی طرف سے حملہ کیا جائے گا، لیکن حملہ اتنی جلدی اور شدت سے ہو گا، یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ ہمیں دشمن کے میدان میں جنگ لڑنی پڑی۔ ہم پر منظم منصوبہ اور پوری طاقت سے حملہ کیا گیا۔ جبکہ ہماری کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ دشمن نے لڑائی کے لئے جو میدان منتخب کیا وہ ہمارا نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے، جن کی توقع ہمارے ساتھی کر رہے تھے۔

سوال: مسٹر عثمان بلوچ! آپ ٹریڈ یونین تحریک کیوں چلا رہے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے اور مقصد کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں؟

جواب: ہمارا مقصد استحصال، ظلم اور جبر و استبداد سے پاک معاشرے کا قیام ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال نہ ہو، جس میں بندہ و آقا کی تمیز نہ ہو، جس میں بھوک، افلاس، غربت نہ ہو، جس میں کسی نوع کی غلامی نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے ہم ٹریڈ یونین کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہماری جدوجہد انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے۔

ہر ایسے ملک میں جہاں کی معیشت نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ ہو۔ مزدور قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرے سے آتے ہیں، اس لئے ان کی سوچ سائنسی نہیں ہوتی۔ لیکن جیسے جیسے وہ صنعتی مزدور بنتے جاتے ہیں، اور مشین سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں، ان کی سوچ سائنسی ہو جاتی ہے۔ سائنسی سوچ، مشین سے وابستگی اور مسائل ان کے سیاسی شعور کو پروان چڑھاتے ہیں، اور ان کا شعور اجتماعی قوت کا سبق دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ جدوجہد اور قربانی دیئے بغیر مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ معاشرے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی معیشت بھی نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ ہے۔ یہاں کے

> **مزدور تحریک کا مقصد**
>
> **غیر طبقاتی**
>
> **معاشرہ قائم کرنا ہے**

آقا اور بندہ کی تمیز مٹ کر رہے گی

خون کے ہر قطرے کا حساب دینا ہوگا

مزدور بھی قبائلی اور جاگیردارانہ ماحول سے آتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ہمارے ہاں ایسی مزدور تنظیمیں تھیں، جو جدوجہد پر یقین نہیں رکھتی تھیں بعض مزدور تنظیموں کی قیادت سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے پاس تھی۔ ایک زمانے میں ڈاکس اینڈ پورٹ مزدور یونین کے صدر محمود ہارون تھے، اور بعض تنظیموں کی قیادت پر اونچے درمیانے طبقے کے افراد قابض تھے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ مزدور تحریک کو انقلابی خطوط پر نہیں چلا سکتے تھے۔ لیکن تاریخ کے ارتقاء اور مسائل کی سنگین نوعیت نے مزدوروں کو آگاہی بخشی۔ اب مزدور اتنے باشعور ضرور ہو گئے ہیں کہ وہ کسی سرمایہ دار کو اپنی یونین کی قیادت نہیں دیتے، البتہ اب بھی مزدور تنظیموں کی قیادت شہریوں کے درمیانہ طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ اس طبقے کا اپنا ایک طبقاتی کردار ہے۔ یہ جدوجہد تو کرتا ہے۔ لیکن اس حد تک نہیں جاتا، جس حد تک مزدور جانا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی مزدور تحریک کی تاریخ گواہ ہے کہ مختلف اوقات پر درمیانے طبقے کے مختلف لیڈر منظر عام پر آئے۔ جدوجہد کے دوران ان کے خلوص، ایمانداری اور دیانت کا پتہ چلا کیونکہ جدوجہد ہی وہ کسوٹی ہے، جو کسی کے مخلص اور دیانت دار ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ مخلص اور دیانت دار قیادت کے گرد اب بھی مزدور جمع ہیں۔ اور موقعہ پرست قیادت آہستہ آہستہ اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ گزشتہ ۲۵ سال کے دوران مزدوروں نے ٹریڈ یونین کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کر کے اپنے وجود کو تسلیم کرا لیا ہے۔ پہلے معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا، ان کی باتیں کوئی نہیں کرتا تھا، لیکن آج تمام بورژوا سیاسی جماعتیں اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ مزدوروں کے مسائل کی باتیں کریں۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ انہوں نے مزدوروں کی اجتماعی قوت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب صنعتی محنت کش اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد کرتے ہیں۔ پہلے مزدور اپنی قیادت کا تابع تھا، لیکن اب قیادت مزدور کے تابع ہے۔ قیادت اپنی من مانی نہیں کر سکتی۔

لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی خامیاں اور کمزوریاں باقی ہیں، کیونکہ مزدور پوری طرح منظم ہیں اور نہ انقلابی، سیاسی نظریات سے مسلح ہیں۔ معاشرے کی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سیاسی جماعتوں کا عکس اس کے ذہن پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی تنظیموں میں بھی یہ جھلک نظر آتی ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا مزدور طبقہ اپنی جدوجہد سے استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔ ایسا معاشرہ جس کی پیشن گوئی میکسم گورکی کی "ماں" کے ہیرو نے ان الفاظ میں کی تھی ——

"میں جانتا ہوں ایک زمانہ آئے گا جب لوگ اپنی خوب صورتی پر حیرت زدہ ہوں گے۔ جب ہر انسان دوسرے تمام لوگوں کے لئے ستارے کی مانند ہوگا۔ اس وقت زندگی انسان کی عظیم خدمت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اور انسان ایک عمدہ اور اعلیٰ چیز بن جائے گا، اس لئے کہ جو لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ ان کو سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ پھر لوگ خوبصورتی سچائی، اور آزادی کے لئے زندہ رہیں گے اور وہ لوگ سب سے اچھے مانے جائیں گے۔ جن کے دل ساری دنیا کو آغوش میں لینے اور اس سے محبت کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ شاندار ہوں گے جو نئی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

س:۔ کیا مزدور طبقے کو سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہیئے اور اگر نہیں تو گزشتہ ۲۵ سالوں میں ٹریڈ یونین تحریک نے اس سلسلے میں کیا کردار ادا کیا؟

ج:۔ مزدور طبقے کو سیاست میں پورا حصہ لینا چاہیئے اور پاکستان کے مزدور سیاست میں حصہ لے رہے ہیں —— درحقیقت کسی بھی معاشرہ میں مزدور اور کسان ہی پیداواری قوت ہوتے ہیں۔ یہ معاشرہ اور ملک کو زندہ رکھتے ہیں۔ اپنے لہو سے اسے پروان چڑھاتے ہیں۔ خوش حال بناتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اگر سیاست ایسے طبقوں کے ہاتھ میں ہو جن کا پیداواری عمل کچھ نہ ہو، تو وہ ملک استحصال، غلامی، بھوک اور افلاس کا نشانہ بن جاتا ہے، درندوں کا ملک بن جاتا ہے۔ کوئی اخلاقی قدر باقی نہیں رہتی، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ملک کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے، مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ موٹر انجن اور باڈی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر انجن کو علیحدہ کر دیا جائے تو موٹر نہیں چلتی۔ انجن کے بغیر باڈی بیکار ہے کسی معاشرہ یا ملک میں مزدوروں اور کسانوں کی حیثیت انجن کی ہے اگر یہ دونوں طبقے معاشرہ سے علیحدہ کر دیئے جائیں یا الگ ہو جائیں تو وہ معاشرہ یا ملک قائم نہیں رہ سکتا۔ ملک کی بقاء اور وجود کے لئے ضروری ہے کہ مزدور طبقہ سیاست میں حصہ لے۔ مگر مزدوروں کی سیاست اور ان کا نظریہ بورژوا سیاست اور ان کی سیاسی جماعتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ کی سیاست یہ ہے کہ وہ اُن بورژوا سیاسی نظام اور معیشت کے خلاف جدوجہد کرے جس نے کروڑوں عوام کو غلام بنا دیا ہے، جن کو استحصالی طبقوں کی حاکمیت کے تحت رکھا جا رہا ہے۔ اور جن کی قسمت کا فیصلہ ایسے گروہ اور معاشرہ کے ایسے لوگ کر رہے ہیں۔ جنہوں نے بھوک، افلاس نہیں دیکھی اور جن کا پیداواری عمل میں کوئی حصہ نہیں ہے، مزدوروں کی سیاست کا مقصد لوٹ کھسوٹ سے پاک معاشرہ قائم کرنا ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں اکثریت کی حکمرانی ہو۔

اب قیادت مزدوروں کے تابع ہو گئی

پاکستان کے مزدور اپنی سیاست میں مکمل طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ آج سے پانچ سال قبل عام لوگ، مزدور اور خاص کر مزدور تنظیمیں یہ کہتی تھیں کہ ملک کی سیاست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ سیاست کی بات چھوڑو وغیرہ، مگر آج مزدور اعلانیہ یہ کہتا ہے کہ ظلم و جبر کا خاتمہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں آتی، اب مزدوروں کی جدوجہد اُن کے مسائل تک محدود نہیں بلکہ اب وہ تمام مظلوم طبقات کی بات کرتے ہیں۔ مہنگائی کا اثر تمام طبقات پر پڑ رہا ہے۔ لیکن مزدوروں کے علاوہ کسی اور طبقے نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ کسان بھی گرانی سے سخت پریشان ہیں لیکن انہوں نے مہنگائی ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ درمیانہ طبقہ بھی خاموش ہے۔ حالانکہ چائے کی میز پر وہ گرانی کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ لیکن مزدور اس کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سے مزدور طبقے کے سماجی اور سیاسی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حکومت اور استحصالی طبقے مزدوروں میں بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری سے خائف ہیں، وہ اپنے ذرائع ابلاغ عامہ سے مزدوروں کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ درمیانے طبقے کے سامنے مزدوروں کو شر پسند، اور تخریب پسند کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ دونوں طبقات کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کی جائے۔ ہمارے پاس ذرائع ابلاغ کی کمی ہے۔ عوام دوست صحافیوں اور دانشوروں سے میری درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔

س:۔ موجودہ مزدور تحریک کس حد تک عوامی جمہوری انقلاب کے راستے پر آگے بڑھ رہی ہے۔

ج:۔ میں نے ابھی بتایا تھا کہ مزدور استحصال سے پاک معاشرہ کے قیام اور اکثریت کی حکمرانی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ابھی وہ انقلابی نظریات سے مسلح ہو رہے ہیں۔ انہیں اپنی اجتماعی قوت کا احساس ہو گیا ہے۔ چند سال پہلے تو وہ سیاست سے دور بھاگتے تھے۔ اور صرف اپنے اقتصادی مسائل کو حل کرانے کے لئے جدوجہد کرتے تھے۔ لیکن اب، تمام مظلوم طبقات کے مسائل کی بات کرتے ہیں۔ اپنی جدوجہد اور جانوں کی قربانیاں دے کر اُسے تسلیم کراتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ کسانوں اور درمیانے طبقے کے افراد، ملازم پیشہ طبقہ کو ساتھ ملائے بغیر عوامی جمہوری انقلاب کی طرف قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا، اب مزدور طلبہ اور دیگر مظلوم طبقات کے اجتماعات میں جاتے ہیں اور اپنے جلسوں میں انہیں مدعو کرتے ہیں۔ ان میں رابطہ بڑھ رہا ہے۔ اور جس دن یہ

> **اپنے خول میں بیٹھ کر اتحاد کی بات نہیں کی جاسکتی**

خلا پُر ہو گئی۔ تو ہماری منزل صاف جھلکنے لگے گی۔

س:۔ مسٹر عثمان! ابھی آپ نے کہا ہے کہ مزدور تحریک عوامی جمہوری انقلاب کے راستہ پر گامزن ہے۔ کیا آپ کے خیال میں مزدوروں کی اپنی انقلابی سیاسی جماعت کے بغیر عوامی جمہوری انقلاب اور سوشلزم کا حصول ممکن ہے؟ اگر نہیں تو اس ضمن میں مزدور تحریک کے باشعور رہنماؤں نے کیا اقدامات کئے؟

ج:۔ مزدوروں کی اپنی انقلابی سیاسی جماعت کے بغیر عوامی جمہوری انقلاب اور سوشلزم کا حصول ناممکن ہے۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ دنیا میں جس ملک میں بھی عوامی جمہوری انقلاب، یا سوشلسٹ انقلاب آیا اس کی رہنمائی مزدوروں کی انقلابی سیاسی جماعت نے کی، مزدور انقلاب کا ہراول دستہ ہوتا ہے اور کسان، اس کا قریبی حلیف، ہمارے ملک میں مزدوروں کی اپنی انقلابی سیاسی جماعت نہیں ہے۔ اس کی وجہ درمیانے طبقے کی مزدور قیادت، پرولتاری قیادت کا فقدان اور مزدوروں میں سیاسی شعور کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی انقلابی سیاسی جماعت کے لئے انقلابی دانشوروں کی موجودگی ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے دانشوروں کی کمی ہے۔ ہمارے دانشور اپنے ڈرائنگ روموں، کلبوں اور چائے خانوں میں تو مزدور اتحاد کی بات کرتے ہیں۔ لیکن وہ مزدور سے عملی ناطہ نہیں جوڑتے۔ لیکن میں اس صورتِ حال سے مایوس نہیں، بحران کی تحریک کے دوران ایسی نوجوان اور انقلابی قیادت اُبھر کر سامنے آئی ہے جس کی اکثریت پرولتاری طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ مزدور اتحاد دن بدن مضبوط ہو رہا ہے شعور بڑھ رہا ہے۔ مزدوروں کی انقلابی سیاسی جماعت، بورژوا سیاسی جماعت نہیں ہوتی کہ چند لوگ مل کر بنائیں اور منشور مرتب کر کے سیاست کے میدان میں کود پڑیں، مزدوروں کی سیاسی جماعت، عمل کے دوران بنتی ہے۔ اور ہم اس سیاسی عمل کے ایک مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

س: کیا یہ خیال صحیح ہے کہ پاکستان کی مزدور تحریک ابھی تک معیشت پرستی کا شکار ہے؟

ج:۔ یہ بات آج سے ۵ سال قبل تک صحیح تھی، لیکن آج نہیں ہے۔ کیونکہ اب مزدور اپنے اقتصادی مسائل کی بات کم کرتے ہیں۔ دوسرے مظلوم طبقات اور سماجی مسائل پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اب مزدور کو معلوم ہو گیا کہ اس استحصالی نظام میں اُجرت میں اضافہ کرنے سے مسائل ختم نہیں ہوتے۔ اُجرت میں اضافہ سے کئی گنا زیادہ گرانی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے وہ اُجرت میں اضافہ کی بجائے مہنگائی ختم کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم اقتصادی مسائل مزدوروں کو جدوجہد کرنے کا عادی بنانے کے لئے اٹھاتے ہیں، تاکہ انہیں ایک طویل اور کٹھن جدوجہد کے لئے تیار کیا جائے ورنہ ہماری تحریک کا مقصد روٹی، کپڑے اور مکان کی لڑائی نہیں ہے۔ بلکہ اس استحصالی نظام کا خاتمہ کرنا ہے۔

س: مسٹر عثمان بلوچ! آپ نے بار بار "مزدور اتحاد" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ کیا مزدوروں کا اتحاد ملک میں موجود ہر نوع کی مزدور تنظیموں کے اتحاد کے ہم معنی ہے؟

ج: مزدور اتحاد کا مطلب عمل میں اور سوچ میں اتحاد

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

اظہار خیال

پاکستان

میں مزدور تحریک کے تجربات



کسانوں، غریب اور متوسط طبقے کے شہریوں سے ناطہ نہیں جوڑا گیا

-: پیکر نقوی :-

پاکستان جس خطہ پر وجود میں آیا تھا وہ بنیادی طور پر زرعی تھا اور اس علاقہ میں صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس حصّہ کی سب سے بڑی صنعت ریلوے تھی جس کے مزدور ٹریڈ یونینوں میں منظم تھے۔ ریلوے مزدوروں کی مستحکم تنظیم ہی وہ سبب تھی جس کی بنا پر وہ انگریزوں کی پروردہ نوکر شاہی اور جاگیردار حکمرانوں کے مشقِ ستم کا نشانہ بنے۔ دونوں بازوؤں میں ریلوے مزدوروں اور ان کے رہنماؤں پر جو ظلم روا رکھے گئے وہ پاکستان کی تاریخ میں محنت کش طبقہ کے لئے ہمیشہ ایک سبق رہیں گے۔

ریلوے مزدوروں پر ظلم وستم کے مواقع فراہم کرنے میں ان محبِ وطن نوجوانوں کی غلطی بھی شامل ہے جنہوں نے یہ خیال کر کے کہ غیر منقسم ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے قیامِ پاکستان کی حمایت کی تھی، یہاں کمیونسٹ پارٹی قائم کر لی اور کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین تنظیم میں کوئی فرق برقرار نہیں رکھا۔ ان نوجوانوں نے غالباً کتابوں میں یہ تو پڑھ لیا تھا کہ مزدور طبقہ ایک انقلابی طبقہ ہے لیکن انہوں نے اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا کہ سرزمین پاکستان پر مزدور طبقہ اپنی تعداد کے اعتبار سے دال میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے جس پر جاگیرداروں نوابوں اور برطانوی سامراج کی نوکر شاہی کی حکمرانی قائم ہے۔ نوکر شاہی اور جاگیردار طبقہ نہ صرف آزادی سے قبل سامراج کا وفادار تھا بلکہ بعد کے واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ آزادی کے بعد بھی سامراج کے وفادار رہے۔ یہ نوکر شاہی اور جاگیردار طبقہ کا ہی کرشمہ ہے کہ انہوں نے قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کو جو اس ملک کے عوام کے انتہائی محبوب رہنما تھے اپنی راہ سے ہٹا کر ملک کی باگ ڈور سنبھال لی اور پھر اس کے بعد جو گل کھلائے گئے وہ سب کے سامنے ہیں۔

نظریہ کے اعتبار سے ہمارے ملک کے نوجوان یہ تو کہتے تھے کہ مزدور طبقہ، کسانوں، غریب اور متوسط طبقہ کے شہریوں کی مدد کے بغیر جمہوریت اور سوشلزم کی جنگ نہیں لڑ سکتا لیکن عملی اعتبار سے انہوں نے اس ملک میں نہ تو کسانوں کی کوئی جمہوری تنظیم بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی غریب اور متوسط طبقہ کے شہریوں سے اپنا ناطہ جوڑا۔ اس دور میں کثیر الطبقاتی تنظیم مسلم لیگ تھی جس کی باگ ڈور اگرچہ جاگیرداروں اور نوابوں کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس کے پرچم تلے مزدوروں سمیت مختلف طبقات کے لوگ اکٹھے تھے۔ ہمارے نوجوانوں نے مسلم لیگ کو صرف مذہبی نام کی بنا پر جاگیردار طبقہ کی جماعت سمجھ کر شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا حالانکہ انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما مہاتما گاندھی خود مذہبی آدمی تھے اور سیاسی باتیں مذہبی اجتماعات میں کرتے تھے اس کے علاوہ یورپ کے تجربات شاہد ہیں کہ سرمایہ دار طبقہ نے بھی مذہب کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ جب تک جاگیرداروں اور نوابوں کی جماعت تھی وہ ڈرائنگ روم تک محدود رہی لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد جب مسلمان سرِعام اس جماعت کی حمایت کرنے لگے تو یہ ایک عوامی تنظیم بن گئی۔ اور اس میں مختلف طبقہ کے مسلمان شریک ہو گئے۔ اس لحاظ سے ہمارے نوجوان دانشوروں کی غلطیوں کی وجہ سے پاکستان میں مزدور تنظیم کو سخت نقصان پہنچا۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

7 جون

جب اجرت مانگنا جرم بن گیا

وهاب صدیقی

۷ جون ۱۹۷۲ء پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا اس دن کا سورج غروب ہوا۔ تو ان گنت گھرانوں کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ ماؤں کے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں منوں مٹی تلے دب چکے تھے، بیویوں کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ مانگ اجڑ چکی تھی، بچے یتیم ہو چکے تھے۔ بھائی اور بہنوں کے دست و بازو ٹوٹ چکے تھے۔ پٹھان کالونی اور فرنٹیر کا ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ ہر مکان سے آہ و فغاں کے نالے بلند ہو رہے تھے، عورتیں بین کر رہی تھیں۔ اور بچے ـــــ ننھے منے بچے پوچھ رہے تھے کہ "ابو ناراض کیوں ہیں۔ بولتے کیوں نہیں"۔ اب انہیں کون بتاتا کہ تمہارے ابو ـــــ پیارے ابو کو "عوامی حکومت" "عوامی پولیس" نے سرمایہ داروں کو خوش کرنے کے لئے ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔ موت کی اس وادی میں بھیج دیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔



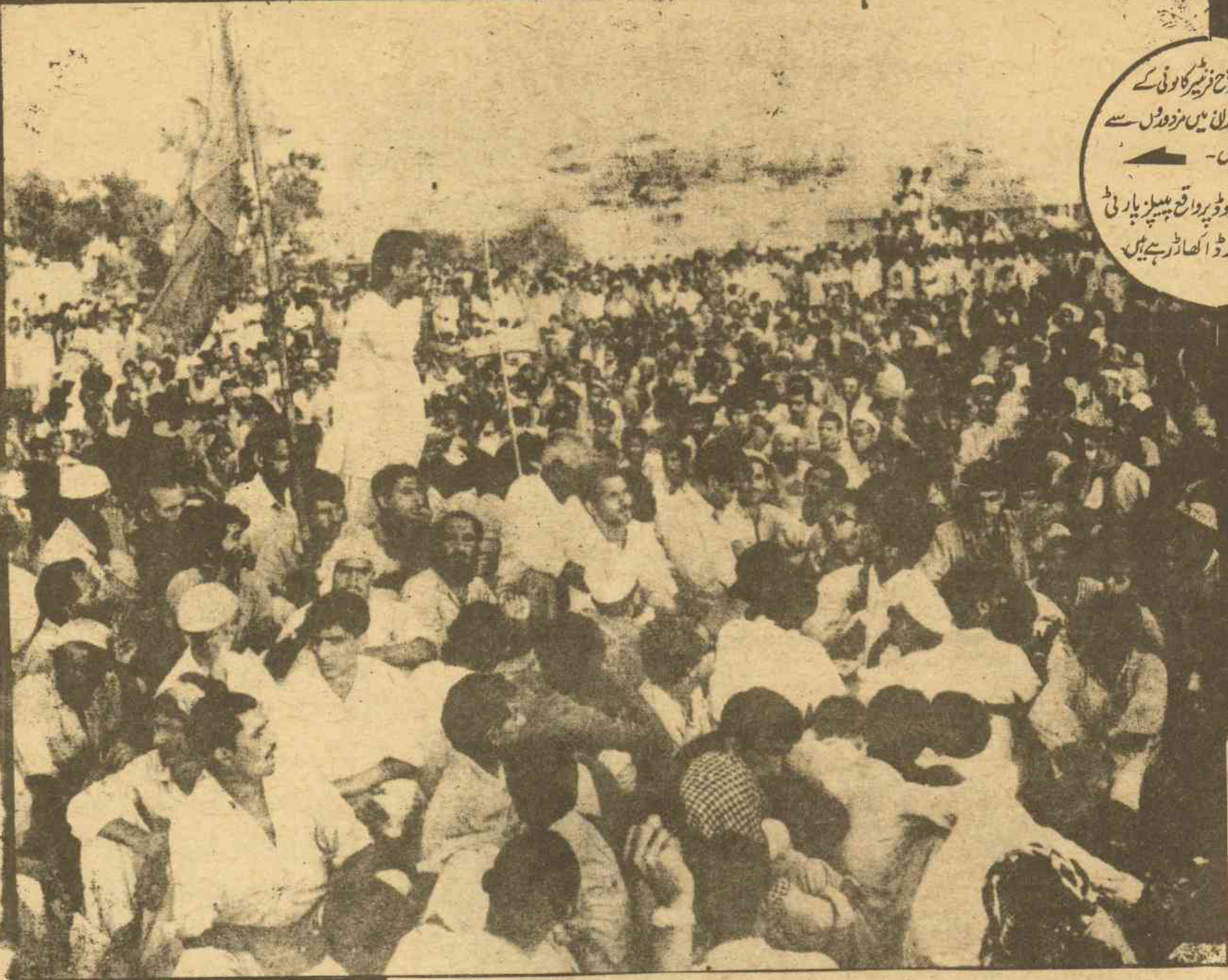


یہ المیہ کیوں اور کیسے رونما ہوا؟ ۷ جون فیروز سلطان انڈسٹریز کے مزدوروں کی تنخواہوں کی ادائگی کا دن تھا۔ تنخواہ کے علاوہ منافع کا ۲½ فی صد حصہ بھی ملنے والا تھا۔ محنت کش اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پرچون فروش سے ادھار لئے جانے والے راشن کی ادائیگی کرنی تھی۔ دودھ والے کو پیسے دینے تھے۔ لیکن دوسری جانب فیروز سلطان انڈسٹریز کے مالک مزدوروں کے لہو سے ہولی کھیلنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ داؤد اور ولیکا کی غیر مشروط رہائی نے ان کے مزدور دشمن منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی تھی وہ دیکھ چکے تھے کہ حکومت نے بیرون ملک سے زرمبادلہ واپس منگوانے کی تاریخ مقرر کی۔ وزیر خزانہ نے زرمبادلہ واپس نہ لانے والوں کو سزائے موت کی دھمکی بھی دی مگر جب زرمبادلہ واپس نہ لایا گیا تو تاریخ میں توسیع کر دی گئی اور توسیع شدہ تاریخ گزارنے کے بعد حکومت نے پر اسرار خاموشی اختیار کر لی۔ کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی بالکل فیروز سلطان انڈسٹریز کو یقین تھا کہ "عوامی حکومت" اور "عوامی پریس" بھی ان کے اشاروں پر رقص کرے گی چنانچہ انہوں نے مزدوروں کو تنخواہ نہ دینے کا فیصلہ کیا، پولیس کو پہلے ہی بلوا لیا گیا۔

جب مزدور اپنی تنخواہ لینے ملز کے دفتر پہنچے تو ملز کی انتظامیہ نے تنخواہ دینے سے انکار کر دیا۔ کراچی انتظامیہ کے پریس نوٹ میں بھی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ملز کی انتظامیہ نے مزدوروں سے کہا کہ ـــــ "اس ماہ کی دس تاریخ تک تنخواہیں نہیں دی جاسکتیں"

خود ہی سوچیے کہ ایک محنت کش پورے ماہ کڑی دھوپ میں محنت کرے محض اس امید پر کہ ایک ماہ کے بعد اس کا معاوضہ ملے گا لیکن جب وہ تنخواہ لینے جائے تو تنخواہ دینے سے انکار کر دیا جائے۔ اس موقع پر وہ کتنا مایوس اور افسردہ ہوگا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو کیا جواب دے گا؟ قرضداروں سے کیا کہے گا۔ اس پر طرّہ یہ کہ فیروز سلطان انڈسٹریز

وارننگ دیئے بغیر مزدوروں پر بندوقو



ـتان بوتح فرنٹیر کالونی کے
کے میدان میں مزدوروں سے
ہے ہیں۔
ـلام روڈ پر واقع پیپلز پارٹی
کا بورڈ اکھاڑ رہے ہیں۔

کی انتظامیہ نے نہ صرف تنخواہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ "لے آف" کا نوٹس بھی لگا دیا یعنی محنت کشوں کو کچھ دنوں کے لیے بیروزگار کر دیا گیا۔

قانون کی محافظ "عوامی پولیس" نے تنخواہ ادا نہ کرنے کے جرم میں ملز کی انتظامیہ اور مالکان کے خلاف کرنے کی بجائے چند مزدوروں کو گرفتار کر لیا۔ کیونکہ مزدوروں نے "لے آف" تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں مزید پولیس طلب کر لی گئی۔ اس وقت ملز میں ہیلمٹ، رائفلوں اور آنسو گیس سے لیس تین پلاٹون پولیس موجود تھی۔ ایس ڈی ایم ہار بر شفیق قریشی مزید پولیس فورس لینے گئے۔ اسی دوران میں دوسری شفٹ کا وقت ہو گیا۔ دوسری شفٹ کے مزدور گیٹ پر جمع ہونے لگے تو موقع پر موجود ڈی ایس پی نور خان (نور خان وہ رسوائے زمانہ پولیس آفیسر ہیں جنہوں نے ۱۹۶۴ء میں ایوب خان کی کامیابی پر گوہر ایوب کی سرکردگی میں نکالے جانے والے جلوس میں ایوبی حکومت سے تعاون کیا تھا۔ گوہر ایوب اور اس کے حواریوں نے لیاقت آباد کے مظلوم عوام پر فائرنگ کی لیکن نور خان نے جو اس وقت لیاقت آباد تھانہ کے انچارج تھے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی) نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ حالانکہ قانون کے مطابق ڈی ایس پی کو فائرنگ کا حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ صرف ایس ڈی ایم یا ڈپٹی کمشنر کو اختیار ہے۔ پھر یہ فائرنگ بھی کوئی وارننگ دیئے بغیر کی گئی۔ ڈپٹی کمشنر کنور ادریس نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ فائرنگ سے قبل کوئی وارننگ نہیں دی گئی۔ اچانک پولیس افسر کی جانب سے فائرنگ کا حکم اور فائرنگ سے قبل وارننگ نہ دینا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ملز کی انتظامیہ اور پولیس کے حکام نے ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کیا۔ کراچی کے ڈپٹی کمشنر کا یہ بہانہ کہ سنگین اور نازک حالات کی وجہ سے وارننگ دینے کی مہلت نہیں ملی، بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہے کیونکہ

ـہانے کھول دیئے گئے

قانون کی اعلانیہ خلاف ورزی کرنیوالے حکومت کے دوست بن گئے

اگر حالات اتنے سنگین ہو چکے تھے تو ایس ڈی ایم ہاربر موقعہ پر موجود کیوں نہیں رہے۔ مزید پولیس فورس وائرلیس کے ذریعے بھی طلب کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ حالات کتنے بھی سنگین کیوں نہ ہوں کسی پولیس آفیسر کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے اور قانون کو توڑنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

جب اس فائرنگ کی اطلاع پٹھان کالونی اور قریبی علاقوں میں پہنچی تو دوسرے ملوں سے آنے والے مزدور فیروز سلطان انڈسٹریز کے سامنے والی سڑک پر جمع ہوگئے پولیس نے سڑک کو دونوں طرف سے گھیر لیا اور پھر دوبارہ فائرنگ کی۔ متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر جناب عثمان بلوچ کے مطابق فائرنگ سے ۲۹ مزدور شہید اور کئی زخمی ہوئے۔ زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے مزدور شعیب کی لاش مزدوروں نے اٹھالی۔ باقی تمام لاشوں پر پولیس نے قبضہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لاشیں کلثوم بائی ولیکا ہسپتال میں رکھی گئیں۔ کراچی انتظامیہ کے پریس نوٹ کے مطابق فائرنگ سے تین مزدور ہلاک ہوئے۔ انتظامیہ کے مہیا کردہ اعداد و شمار پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کراچی کی انتظامیہ جھوٹ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ یادش بخیر! ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک کے زمانے میں ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو کراچی پولیس نے آرام باغ کی مسجد میں بوٹوں سمیت داخل ہوکر نمازیوں پر لاٹھی چارج کیا۔ اخباری نمائندوں کو زدوکوب کیا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر کی جانب سے جو پریس نوٹ جاری ہوا۔ اس میں کہا گیا کہ پولیس مسجد میں داخل نہیں ہوئی۔ لیکن روزنامہ مشرق نے ایک تصویر جس میں پولیس مسجد میں داخل ہورہی تھی، شائع کرکے کراچی انتظامیہ کے جھوٹ کا پردہ چاک کردیا تھا۔ بی بی سی ریڈیو نے ۷ اور ۸ جون کو ہلاک ہونے والوں کی تعداد پچاس بتائی ہے۔ ریڈیو پاکستان ٹیلی ویژن اور سرمایہ داروں کے اخبارات پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ حکومت کے پٹھو ہیں اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ! حالیہ پاک بھارت جنگ کے دوران میں بھی جھوٹی خبریں شائع کرتے رہے۔ خود صدر بھٹو نے ۲۴ جنوری ۷۲ء کی تقریر میں پاکستانی پریس کو حکومت کا پٹھو قرار دیا تھا۔

۷ جون کو پولیس نے چودہ مزدوروں محمد اشرف بارڈر شمس الرحمٰن، پشمین خان، محمد نعمان، محمد عزیز، فردوس، مقبر خان، گل رحمان، محمد اقبال، نعمت الدین، مریم خان، حباب خان اور سعید احمد کو زیر دفعہ ۱۴۷، ۱۴۹، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳ اور ۵۰۶ تعزیرات پاکستان گرفتار کرلیا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ، پاکستان ورکرز فیڈریشن مزدور رابطہ کونسل، سندھ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز پاکستان، پاکستان ٹیکسٹائل لیبر یونین اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن نے ایک مشترکہ ہنگامی پریس کانفرنس میں ایس ڈی ایم ہاربر، ڈی ایس پی نور خان اور ایس ایچ او سائٹ کی برطرفی اور فائرنگ کے ذمہ دار لوگوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔

اس رات پٹھان کالونی سے آہ و فغاں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہر گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ محمد شعیب کی لاش عیدگاہ کے میدان میں رکھی ہوئی تھی۔ ہزاروں مزدور اس کے گرد جمع تھے۔ میّت کے سرہانے سُرخ پرچم لہرا رہا ہے یہ سُرخ پرچم جو آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے جو محنت کشوں کے حقوق کی ضمانت ہے جو اِن کی آزادی، معاشی اور سیاسی آزادی کا پیامبر ہے۔ پاکستان کے محنت کشوں کو اتحاد کی دعوت دے رہا تھا۔ شعیب شہید کے خون نے اس کی لالی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ یہ سُرخ پرچم بتا رہا تھا کہ ظالم اور مظلوم کی واضح تفریق ہوچکی ہے۔ ظالم متحد ہیں، مظلومو! تم بھی متحد ہوجاؤ، طبلِ جنگ بج چکا ہے — ظالم مظلوموں کو تشدد کے ذریعے کچلنا چاہتے ہیں — ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ حق طلب نہ کرسکیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ مظلوم اُٹھ کھڑے ہوں اور آخری جنگ کے لیے اپنے اپنے مورچے سنبھال لیں۔ دوسری طرف نام نہاد "ترقی پسند" اور "انقلابی" ڈرائنگ روموں، ہوٹلوں میں بیٹھے یہ فتوٰی دے رہے ہیں کہ مزدوروں کی اس تحریک سے جماعتِ اسلامی اور نیپ کو فائدہ ہوگا۔ وہ عوام دشمنوں اور مزدور دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ لیکن اگر انہیں پٹھان کالونی میں جانے کی توفیق ہوتی تو وہ محنت

---

7 جون
تحریک کے شہدا

(۱) پیند محمد شہید - زیبِ تن ٹیکسٹائل ملز میں ملازم تھے، لاش سوات بھیج دی گئی - ان کا بھائی خستہ محمد کراچی میں ہے - باقی اہلِ خانہ سوات بھائی خستہ محمد کراچی میں ہے - باقی اہلِ خانہ سوات میں ہیں۔

(۲) محمد شعیب شہید - زیبِ تن ٹیکسٹائل ملز میں ملازم تھے - اہلِ خانہ سوات میں ہیں۔

(۳) رضاخان شہید - ملازمت فیروز سلطان ملز - لاش سوات بھیج دی گئی تھی - اُن کا بھائی دوا خان ملز - لاش سوات بھیج دی گئی تھی - ان کا بھائی دوا خان کراچی میں ہے۔

(۴) محمد یار شہید - ملازمت جوبلی اسپننگ ملز - ان کے بال بچے اور بھائی مُبین کراچی میں ہیں۔

(۵) محمد نذیر شہید - ملازمت، دوست محمد کاٹن ملز - اُن کے بال بچے کراچی میں ہیں - ایک بھائی بے نظیر جامعہ ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا ہے - اور پٹھان کالونی میں رہتا ہے۔

(۶) نیک زادہ شہید - ملازمت العظمت سلک ملز - بیوی اور دو بچے ہیں - والد بھی کراچی میں ہیں، غلام حبیب اُن کا نام ہے۔

(۷) میاں عمر شاہ شہید - باٹا کمپنی لالو کھیت میں ملازم تھے۔

(۸) محمد ارشاد شہید - پولیس میں ملازم تھے - لیکن ۸ جون کو گھر پر پانی بھرتے ہوئے شہید ہوئے۔

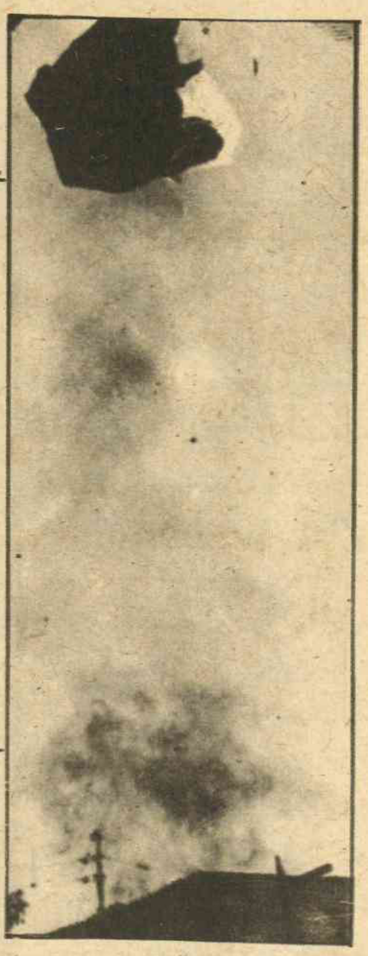
کشتوں کے تیور دیکھتے جو کہہ رہے تھے ؎

ہم بھان چکے ہیں اب جی میں ، ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو، ہم آگے بڑھتے جائیں گے

---

۸ جون کو تقریباً دس بجے صبح شعیب شہید کا جنازہ پٹھان کالونی سے روانہ ہوا۔ ہزاروں مزدور جنازے میں شریک تھے۔ جنازہ بنارس کالونی کے چوراہے کی جانب بڑھنے لگا۔ مزدور پُرامن تھے۔ لیکن جیسے ہی جنازہ بنارس کالونی کے چوراہے پر پہنچا پولیس کی بھاری تعداد "مارو، مارو" کہہ کر نہتے مزدوروں پر ٹوٹ پڑی۔ آنسو گیس پھینکی اور اندھا دُھند فائرنگ کی۔ پندرہ منٹ تک فائرنگ ہوتی رہی اور تقریباً ۱۰۹ راؤنڈ چلائے گئے اس سے بارہ مزدور ہلاک ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں دوست محمد ملز کے پراپیگنڈہ سیکرٹری، عثمانیہ ملز کا رحیم زادہ، بٹکہ ملز کی یونین کے جنرل سیکرٹری میاں عمر شاہ، العظمت ٹیکسٹائل ملز کا مزدور نیک زادہ، دوست ملز کا خستہ رحمان، ولیکا ملز کا فٹر رشید خان اور ایک مزدور خیبر خان شامل تھے۔ رشید خان اور خیبر خان جنازے کو کاندھا دے رہے تھے اور سب سے آگے تھے اس لیے ان کی لاشیں پولیس والے لے گئے۔ فائرنگ سے ایک خاتون اور اس کا نو ماہ کا بچہ امید زادہ بھی ہلاک ہو گیا۔ اس وقت ولیکا اور حافظ ٹیکسٹائل ملز کے سامنے انڈس رینجرز اور پولیس کے ریزرو دستے کھڑے تھے۔

ابتدا میں کراچی کی انتظامیہ نے یہ جواز پیش کیا کہ مزدوروں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تھی اس لیے فائرنگ کرنی پڑی۔ حالانکہ جنازے پر دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ نہیں ہوتا۔ اس کے اگلے دن ڈپٹی کمشنر نے اعتراف کیا کہ پٹھان کالونی اور دیگر آبادیوں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں کی گئی تھی۔ صرف سائٹ میں نافذ کی گئی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پولیس پٹھان کالونی اور بنارس کالونی کے اطراف میں کیوں لگائی گئی کیا یہ ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں ہوا کہ مزدوروں کے لہو سے مزید ہولی کھیلی جائے۔ کیونکہ سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی پیاس ابھی بجھی نہیں تھی۔



پیپلز پارٹی کے جھنڈے کو آگ لگا کر ہوا میں اچھال دیا گیا۔

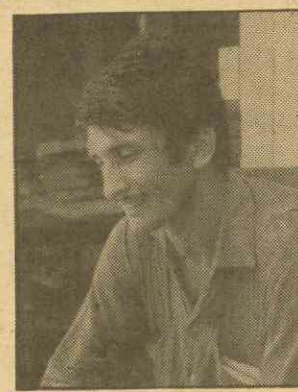
اس فائرنگ کے بعد کراچی کی مزدور تنظیموں کی مجلسِ عمل نے جس کی صدارت جناب نبی احمد کر رہے تھے مطالبہ کیا کہ وزیر اعلیٰ، وزیرِ محنت اور وزیرِ صنعت کو برطرف کیا جائے ایس ڈی ایم ملیر، ڈی ایس پی اور ایس ایچ او کو معطل کر کے ان پر قتل کے الزام میں دفعہ ۳۰۲ کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔ فیروز سلطان انڈسٹریز کے مالکان کو بھی گرفتار کر کے ان پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۱۰ جون کو ملک بھر میں عام ہڑتال رہے گی۔ اور جب تک مزدوروں کے مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے اس وقت تک لانڈھی، کورنگی اور سائٹ کے صنعتی علاقہ میں غیر معینہ مدت تک ہڑتال جاری رہے گی۔ ابھی مجلسِ عمل کا اجلاس ختم ہی ہوا تھا کہ جناب نبی احمد جناب واحد بشیر اور دیگر پانچ مزدوروں کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اگلے دن انہیں رہا کر دیا گیا۔

چند زخمیوں کے نام

(۱) محمد عارف - جوبلی اسپننگ ملز،
(۲) قاسم - فیروز سلطان ملز،
(۳) خستہ محمد - دوست محمد کاٹن ملز،
(۴) اول خان - فیروز سلطان ملز،
(۵) نعمت زادہ - زیب تن ٹیکسٹائل ملز،
(۶) رحیم زادہ - عثمانیہ ٹیکسٹائل ملز،
(۷) میاں گل طالب جان - زیبِ تن ٹیکسٹائل ملز،
(۸) معمبر خان - زیب تن ٹیکسٹائل ملز -
(۹) سید احمد خان -
(۱۰) محمد زاہد - ٹھیلا چلاتا ہے -

سائٹ کے باشعور اور جیالے مزدوروں کی ہڑتال ۱۲ دن تک جاری رہی۔ اس دوران میں حکومت صوبائی وفد اور کراچی کی شہری انتظامیہ نے مزدوروں کو آپس میں لڑانے اور ان کے اتحاد کو توڑنے کی کوششیں کیں۔ لیکن محنت کشوں نے ان تمام حربوں کو ناکام بنا دیا۔ حکومت اور شہری انتظامیہ نے اس عرصے میں مزدور رہنماؤں سے گفت و شنید کی، اور اسکی کوشش تھی کہ وہ ہڑتال کو طول دے کر اس عظیم جدوجہد کو ناکام بنا دے لیکن باشعور مزدوروں نے حکومت کی اس چال کو ناکام بنا دیا۔ اور ۱۹ جون کو نشتر پارک میں ہڑتال ختم کرنے کا اجتماعی طور پر فیصلہ کیا۔

اس فائرنگ سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کش اپنی جدوجہد سے برسرِ اقتدار لانے والی جماعت سے بھی اپنے مسائل حل نہیں کروا سکتے۔ کیونکہ انتخابات سے نظام تبدیل نہیں ہو سکا، صرف چہرے تبدیل ہوتے ہیں۔ ریاست کی استحصالی مشینری جوں کی توں برقرار رہتی ہے، استحصال ہوتا رہتا ہے اور اس سے نجات کا واحد حل انقلاب ہے —— سوشلسٹ انقلاب!



باور خاں
کسی فرد کا نہیں
تحریک کا نام ہے

:- الفتح رپورٹ :

جیل کے اندر مزدور رہنما پر تشدد کیا جا رہا ہے

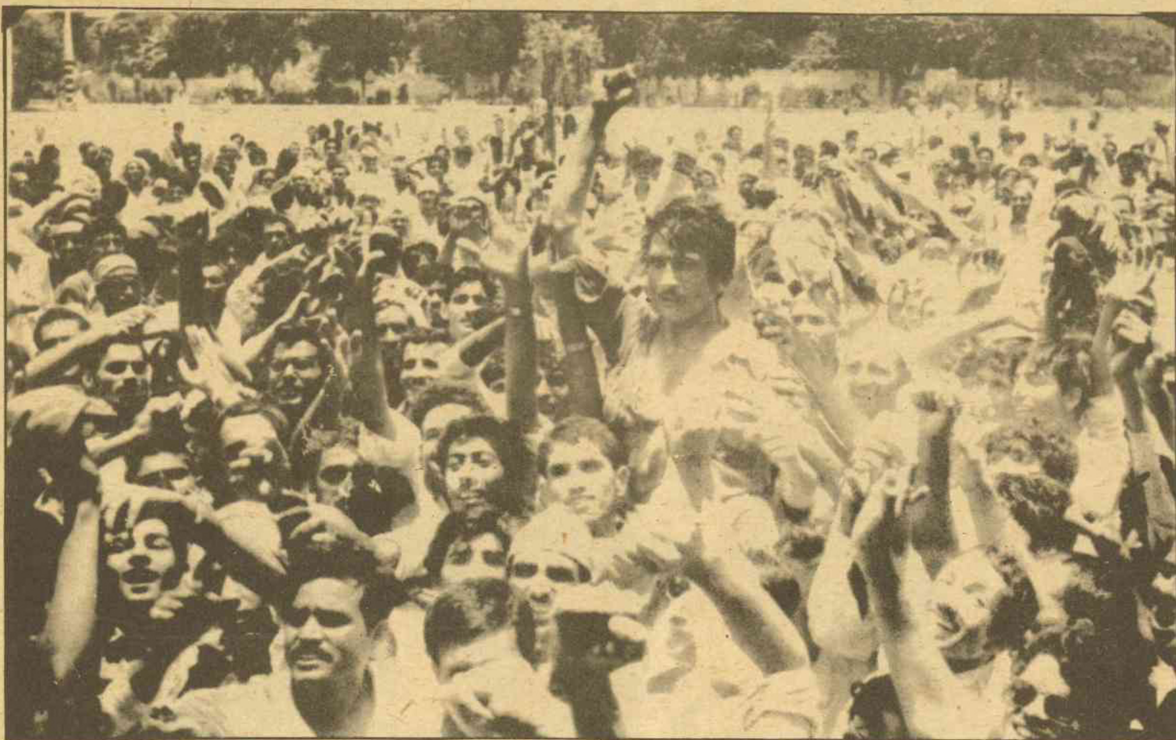
دنیا بھر کی تاریخ الگ رکھ دیجئے، خود اس ملک کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، محنت کشوں نے ہر مشکل وقت میں وطنِ عزیز کے لئے قربانیاں دیں۔ پاکستان بنانے والے یہی مزدور تھے۔ تاریخ کے کس موڑ پر مزدوروں نے ملکی مفادات سے غداری کی؟ اس کا ایک بھی ثبوت پیش کریں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایسی ایک بھی مثال نہیں ملے گی۔ ہاں۔ مزدوروں کو "غدار"، "غیر ملکی ایجنٹ" اور "شرپسند" کہنے والوں کے بارے میں غداری، ملک دشمنی، اور وطن فروشی کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ ہماری جدوجہد بتائے گی اور تاریخ اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ ملک کا وفادار کون ہے، اور ملک دشمن کون؟

یہ خیالات زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے صدر جناب باور خان کے ہیں، جو کم و بیش نو ماہ سے پاکستان کی مختلف جیلوں میں ڈی، پی آر کے تحت "بے گناہی" کی سزا بھگت رہے ہیں۔ انتظامیہ کی جانب سے ان پر مزید دو تین "اخلاقی الزامات" بھی عائد کئے گئے۔ ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے ایک لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ یہ بوگس اور انتہائی گھٹیا قسم کے الزامات تھے جن کا مقصد مزدور برادری اور عوام میں باور خان جیسے بے داغ، مخلص اور مقبول رہنما کو بدنام کرنا تھا۔ لیکن خودسر اور سازشی انتظامیہ کی ترکش کے یہ زہریلے تیر بے کار گئے۔ باشعور مزدور طبقہ اور عوام نے یہ مذموم الزامات مسترد کر دیئے۔ اُلٹا انتظامیہ اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے دامن پر بدنامی کے مزید دھبے اُجاگر ہو گئے۔

صوبائی حکومت نے جب دیکھا کہ وہ عدالت میں ان "اخلاقی الزامات" کو ثابت نہیں کر سکتی تو اس نے کمال عیاری سے مقدمات واپس لے لئے، لیکن ڈی پی آر کے تحت انکی نظربندی کی مدت میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ اس دوران باور خان کو پاکستان کی مختلف جیلوں میں پھرایا گیا۔ جیل کے اندر مختلف طریقوں سے ان پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ انہیں قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے، اور عدالت میں الزام ثابت کئے بغیر ان سے مشقت لی جاتی ہے۔ بعض اوقات انہیں کال کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ملاقاتیوں کو ملنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اور انہیں جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ نظربندی کے دوران باور خان پر یہ سارے ظلم و تشدد اسلئے کئے جا رہے ہیں کہ وہ حکومت کے سامنے اپنا سر جھکا دیں اور اپنے عظیم مشن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ لیکن یہ حکمران ٹولے کی سب سے بڑی بھول ہے، باشعور مزدور نہ کبھی بکا ہے۔ نہ اس نے جابرانہ ہتھکنڈوں کے سامنے اپنا سر جھکایا ہے۔ ضمیر فروشوں کی بات چھوڑیئے کہ ہر دور میں ان کا سودا ہوا ہے، انہوں نے مزدوروں کی لاشوں کی قیمت وصول کی ہے۔ لیکن یہ دنیا سقراط، منصور، نیگو دان ترانگے، حسن ناصر اور لوممبا سے بھی کبھی خالی نہ رہی، ہر عہد اور ہر دور میں ماؤں نے ایسے بیٹے بھی جنم دیئے ہیں جنہوں نے ہنستے ہوئے زہر کا پیالہ پی لیا اور پھانسی کا پھندہ چوم لیا۔ ایسے لوگوں کو قارون کے خزانے سے بھی نہیں خریدا جا سکا۔ نہ ہی انہوں نے ظلم کی انتہائی شکل کے سامنے اپنا سر جھکایا۔ ایسے لوگ تاریخ ساز ہوتے ہیں، اپنے قول و عمل سے تاریخ مرتب کرتے ہیں۔

۷ رجون کی اندھا دھند فائرنگ کے دوران باور خان اپنے مزدور ساتھیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ وہ آج بھی جیل کی تنگ و تاریک اور گھٹی گھٹی فضا میں تمام سختیاں، تشدد اور ظلم ہنستے مسکراتے ہوئے برداشت کر رہا ہے۔

۱۹ رجون ۱۹۷۲ء کو نشتر پارک میں ۷ رجون کی تاریخ ساز ہڑتال کے خاتمے کا اعلان اجتماعی طور پر کیا گیا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد پُرجوش مزدور باور خان کو اپنے کندھے پر اٹھا کر باہر نکلے۔ باور خان وائٹ کالر مزدور رہنما نہیں ہے، اسے مزدوروں نے جنم دیا ہے۔ زیب تن ٹیکسٹائل ملز میں معمولی مزدور ہے۔ وہ سب کا چہیتا ہے۔ دوسرے دن اخبارات میں اس کی تصویر چھپی اور وہ انتظامیہ کی آنکھوں کا کانٹا بن گیا۔ اس واقعہ کے



مزدور اپنے رہنما باور خان کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد کراچی کے صحافیوں کی جانب آٹھ مزدور فیڈریشنوں کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں دوسرے مزدور رہنماؤں کے ساتھ زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے صدر باور خان نے بھی شرکت کی تھی۔ ان سے پہلی بار ملاقات کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان سے بہت سارے سوالات کیئے تھے۔ انہوں نے دو ٹوک میں جواب دیئے۔ سادہ طبیعت اور مزاج کے باور خان نے کہا تھا "مزدوروں پر ملک دشمنی کا الزام لگانے والے خود ملک دشمن ثابت ہوتے۔ اس ملک کا مزدوروں سے بڑھ کر کوئی اور طبقہ وفادار نہیں ہو سکتا کیونکہ محنت کشوں نے اس زمین کو اپنا لہو دیکر پروان چڑھایا ہے۔"

ستم ظریفی دیکھئے کہ مشین کا پہیہ چلانے والے، ملک کو دولت سے مالا مال کرنے والے اور اپنے لہو سے اس دھرتی کو سینچنے والے ان دنوں ایسے قانون کے تحت نظربند ہیں، جو صرف ملک دشمن افراد پر لاگو کیا جاتا ہے۔ باور خان نے ہمیشہ اپنے مزدور ساتھیوں کے ساتھ سونا اگلنے والی اس دھرتی کے تحفظ میں عملی حصہ لیا۔ آج وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ اسی قانون کے تحت جیل کاٹ رہا ہے۔

اس ملک کے حکمرانوں کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے، کہ مزدوروں پر اس قسم کے الزامات لگانے سے انہیں کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ میں آج تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ملے گا، جس نے یہ ثابت کیا ہو کہ محنت کشوں کی جدوجہد ملک کے مفادات کے خلاف رہی ہے۔ مزدور وہ واحد طبقہ ہے جس پر ملکی مفادات سے غداری کا الزام لگانا تو کجا سوچنا بھی گناہ ہے۔ یہاں کی سیاسی تاریخ نے البتہ یہ ضرور ثابت کیا ہے کہ غدار حکمران ٹولے سے پیدا ہوئے ہیں۔

مزدوروں کی تحریک کا بنیادی مقصد ملک و قوم کو ملک دشمن اور سامراجی ایجنٹوں سے پاک کرنا ہے۔ انکی جدوجہد سے ہمیشہ ایسے لوگوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طریقہ سے غیر ملکی طاقتوں سے گٹھ جوڑ کر کے ملک و قوم کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مکروہ عزائم کو چھپانے کے لئے بے گناہ افراد پر اس قسم کے گھناؤنے الزامات لگاتے ہیں۔ اپنی معصومیت اور بے گناہی کی قسمیں کھا کر عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

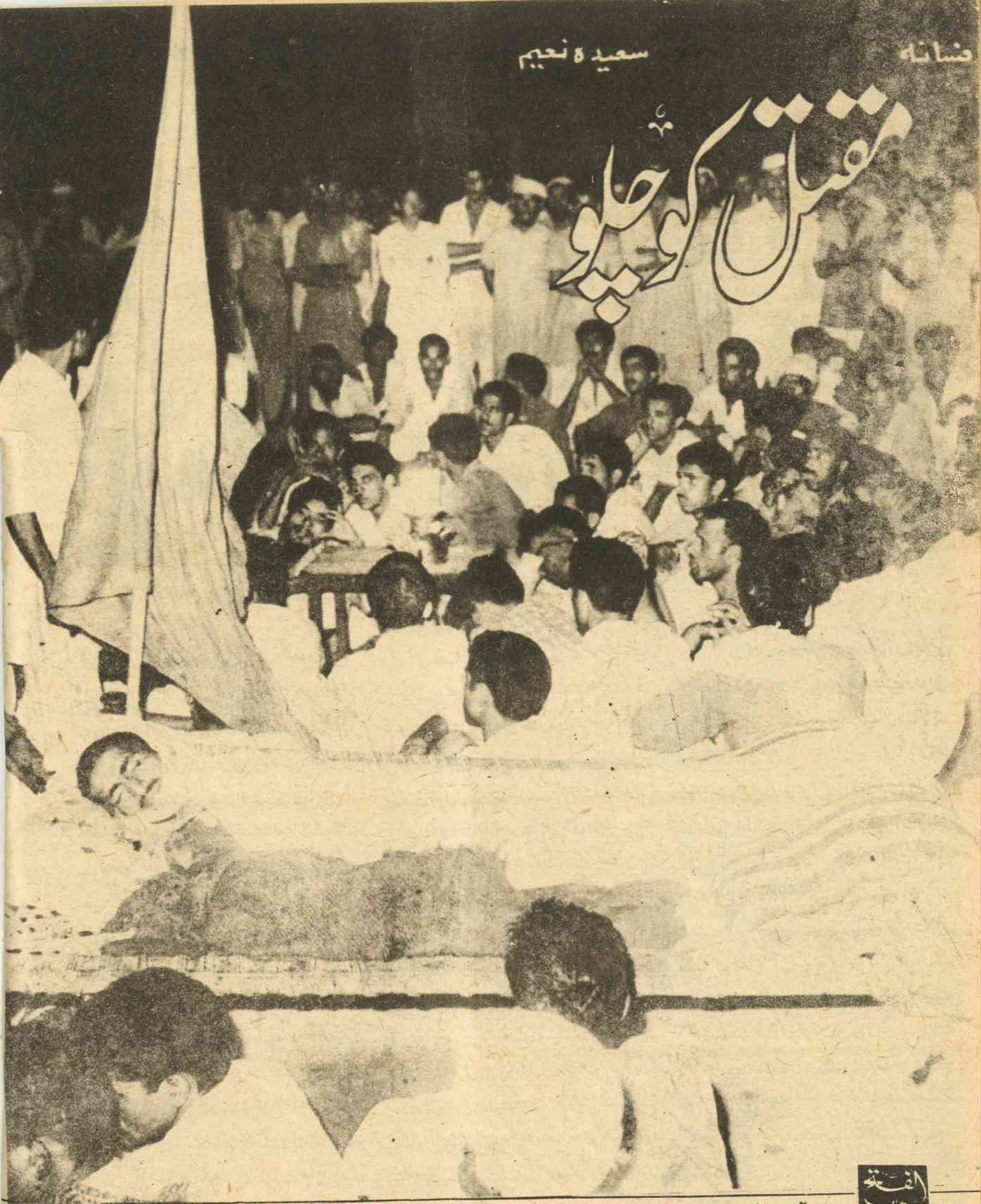
اگر باور خان اور دوسرے مزدور رہنماؤں کی سرگرمیاں ملکی مفادات کے خلاف ہیں تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے اور اپنے الزامات کو ثابت کرے۔ لیکن شاید حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ اگر اس قسم کے الزامات میں ذرا برابر سچائی ہوتی تو وہ بہت پہلے ان کے ساتھ منصفانہ کارروائی کرتی، اور اپنے الزامات کو ثابت کرتی۔ ڈی۔ پی۔ آر کے تحت نظربندی اس بات کا کافی ثبوت مہیا کرتی ہے کہ حکومت کے پاس باور خان اور دوسرے مزدور رہنماؤں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ اس لیئے وہ کھلی عدالت میں آنے سے گریز کرتی رہی ہے۔

حکومت کی یہ خام خیالی ہے کہ اس طرح وہ محنت کشوں کی جدوجہد کا گلا گھونٹ دے گی۔ تحریک افراد سے نہیں، نظریے اور اصولوں سے چلتی ہے۔ ایک باور خان تو کیا سینکڑوں باور خان کو نظربند کر دیا جائے، تحریک ہمیشہ آگے بڑھے گی۔ کیونکہ جدوجہد کی تاریخ ہمیشہ آگے کی جانب بڑھتی ہے، پیچھے نہیں لوٹتی۔

فسانہ

سعیدہ نعیم

مقتل کو چلو



سیفو بڑی دیر سے چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی راکھ کُرید رہی تھی۔ چولہا کبھی کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ لیکن راکھ کے اندر چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ جب وہ بلا مقصد پھونک مارتی تو راکھ کی تہوں سے چنگاریاں نکل کر اِدھر اُدھر اڑنے لگتیں۔ چولہے کے اُوپر رکھی ہوئی سالن کی پتیلی آگ کی گرمی اور میل سے سیاہ ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے گھٹنوں میں سے سر نکال کر آنگن کی طرف دیکھا۔ پلنگڑی پر اس کا چھوٹا سا بچہ میٹھی نیند سو رہا تھا۔ پلنگڑی کے قریب ہی ایک میلی سی دری بچھی تھی جس پر اُس کی آٹھ سالہ بچی زینب اور اس کا بڑا لڑکا گھگھو بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان کے بارے میں باتیں کرتے کرتے سو گئے تھے۔

وہ دونوں آسمان سے خائف رہتے تھے، کیونکہ ان کی ماں نے یہی سمجھایا تھا کہ سارے دُکھ اور سارے عذاب آسمان سے اترتے ہیں۔ گھگھو اکثر اپنی ماں سے پوچھتا۔ "ماں ہم غریب کیوں ہیں، ہمارے گھر میں کھانے کا ناغہ کیوں ہوتا ہے۔ دیکھو میری ایک ہی قمیص ہے جو جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ میں اسکول بھی نہیں جاتا۔ آخر کیوں ماں، میرا ابا تو بڑا محنتی ہے، وہ دن بھر کام کر کے کتنا تھک جاتا ہے۔ پھر بھی ہم غریب ہیں۔ سالن نہیں پکتا۔ روٹی نہیں ملتی۔ آخر کیوں ماں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟"

گھگھو کی ماں یہ سارے سوالات سُن کر پریشان ہو جاتی۔ وہ اپنے بیٹے کی ذہانت پر دِل ہی دل میں خوش ہوتی۔ لیکن اس کے پیچیدہ سوالات اس کے لئے اُلجھن بن جاتے۔ اُسے خود یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس کا شوہر شعیب اتنی کڑی مشقت کرتا ہے، پھر بھی اس کے گھر کا خرچ نہیں چلتا۔ وہ صبح سویرے کارخانے چلا جاتا اور چراغ جلنے کے بعد گھر آتا۔ اتنی محنت کے باوجود وہ اس کیلئے سونے کی بالی اور چوڑیاں نہ لا سکا۔ بھلا وہ لاتا بھی کہاں سے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شوہر کی اتنی کڑی محنت کے باوجود دو وقت کی روٹی مشکل سے ملتی ہے۔ شادی کے وقت شعیب کیسا کڑیل جوان تھا، آنکھوں کے نیچے رخساروں پر سُرخی دوڑتی تھی۔ اور اس کے پاؤں کی دھمک سے زمین کانپتی تھی۔ مگر اب اس کے دیکھتے دیکھتے وہ ہڈی کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ کارخانے سے واپس آتا تو وہ چارپائی پر گھنٹوں بیٹھا اپنی سانسوں کو درست کرتا۔ پھر کہیں جا کر اس سے کھانا مانگتا۔ شعیب کی یہ حالت دیکھ کر اس کا کلیجہ اندر ہی اندر کٹنے لگتا۔ وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کارخانے کی مشینیں اس کے خون سے چلتی ہیں، لیکن کارخانے کے مالک نے کبھی بھولے سے اس کی حالت پر رحم کھا کر ایک پیسہ زیادہ نہیں دیا۔ وہ اپنے شوہر سے کیسے ضد کرتی کہ وہ اس کے لئے سونے کی بالیاں اور چوڑیاں لا دے۔ اور پھر اس بستی کے تمام گھروں کا بھی تو یہی عالم تھا۔

گھگھو جب اپنی ماں سے غریبی کی وجہ پوچھتا تو وہ پریشان ہو جاتی۔ آخر وہ اپنے بیٹے کو کیا بتاتی، اُسے خود اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو بہلانے کے لئے کہتی۔ "گھگھو دیکھ یہ جو آسمان ہے نا وہ ہم سے ناراض ہے۔ بس وہیں سے یہ ساری مصیبتیں آتی ہیں۔"

گھگھو اپنی ماں کی باتیں سن کر آسمان کو گھورنے لگتا۔ "اچھا تو یہ ہے ہماری ساری مصیبتوں کی جڑ۔" وہ اپنا سینہ پُھلا کر کہتا، "ماں مجھے بڑا ہونے دے، بابا کے ساتھ مِل کر اُسے ہرادوں گا۔ اس سے گِن گِن کے بدلے لوں گا۔"

وہ اس وقت چولہے کے پاس بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ آگ کبھی کی بُجھ چکی تھی البتہ راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں ابھی زندہ تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شعیب آجائے تو پھونک مار کر کھانا گرم کر دے گی۔ آج خلافِ معمول شعیب کے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ پورا گھر خاموشی میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دروازہ اندر سے بھڑا ہوا تھا۔ کبھی تیز ہوا چلتی تو کواڑ کھل جاتے اور پھر ایک تیز اور تکلیف دہ چرچراہٹ کے ساتھ خود بخود بند ہو جاتے۔ باہر گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ سبھی سو گئے تھے یا پھر گھروں کے اندر آنے والوں کا انتظار ہو رہا تھا۔

گھگھو نیند میں بڑبڑایا۔ "ابا۔ ابا دیکھ زینب شرارت کر رہی ہے۔" پھر وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔ گھگھو کی آواز سے لمحہ بھر کے لئے خاموشی چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ سیفو چولہے کے پاس سے اُٹھ کر آنگن میں آگئی، زیبو چت لیٹی تھی اور اس کا پیر گھگھو کی کمر پر پڑا تھا۔ اس نے زیبو کو الگ کر کے کروٹ کر دی۔

سیفو نے بڑے غور سے زیبو کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے آنسوؤں کی پتلی سی دھار خشک ہو کر ایک لکیر سی بن گئی تھی۔ شاید وہ نیند میں کوئی بھیانک خواب دیکھ کر رونے لگی تھی۔ اُسے زیبو پر بڑا رحم آیا۔ اس کی مامتا جاگ اُٹھی۔ اس نگوڑی نے سُکھ کا ایک دن بھی نہیں دیکھا۔ جب سے پیدا ہوئی ہمارے دُکھ میں حصہ دار بن گئی۔ سُرخ گوٹے کی اوڑھنی کی کتنی تمنا ہے، مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ عید، بقر عید بھی سادہ کپڑوں میں گذر جاتی ہیں۔ آخر اس کا باپ بھی کیا کرے۔ چوری کرنے سے تو رہا۔ جو کچھ کماتا ہے، لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ وہ بڑے پیار سے زیبو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ ماں کی انگلیوں کی گرمی کو شاید زیبو نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک تیز سسکاری بھرتی ہوئی دوسری کروٹ ہو گئی۔ سیفو کی آنکھیں بھر آئیں۔

باہر گلی میں کوئی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گزر گیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لمحہ بھر کو یہی خیال ہوا کہ شاید شعیب کارخانے سے واپس آگیا، لیکن جب قدموں کی آہٹ دور چلی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی راہ گیر تھا۔

آخر آج شعیب کو اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ وقت سے گھر آتا تھا۔ شاید وہ کسی کام میں لگ گیا ہو گا۔ اس کی سوچ نے تھپکی دی، لیکن ایسا کون سا کام نکل آیا کہ اس میں اتنی دیر ہو گئی۔ وسوسے نے سر اُبھارا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ جب کہ شعیب کو ۶ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ یہاں سے کارخانہ بھی اتنا دور

نہیں ہے۔ پھر وہ کہاں رہ گیا۔؟

ادھر کئی دنوں سے وہ چپ رہنے لگا تھا۔ اُس نے کئی بار اپنی بیوی سے کہا۔ "سیفو ہماری بھی کیا ذلت کی زندگی ہے۔ محنت بھی کرو، اور سیٹھ کی گالیاں بھی کھاؤ۔ اس ذلت بھری زندگی سے تو موت لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ہاں، مگر موت بھی مردوں کی موت ہو۔ چوہے بلی کی نہیں"

ایک دن کارخانے سے واپس آیا تو اس کا بیمار زدہ چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس نے سب کو اپنے پاس بُلا کر بٹھا لیا، سیفو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سیفو تم نے ہر آزمائش کی گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔ تم نے کبھی اُف نہ کیا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر تم نہ ہوتی تو میں دُکھ بھری زندگی کی گاڑی کیسے کھینچتا۔ لیکن اب آنے والے حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ کارخانہ دار اپنے تمام وعدوں سے مکر گیا۔ بونس دینے سے انکار کر دیا۔ اس ہفتے کا بھتہ بھی نہیں دیا۔ ہماری یونین نے اس کے سامنے مطالبات پیش کئے تھے۔ اس نے عہدیداروں سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور دھونس دی ہے کہ اگر کسی مزدور نے ہڑتال کی تو کارخانے کو بند کر دیا جائے گا۔ یونین والوں کو جیل میں سڑا دیا جائے گا اور مار مار کر کچومر نکال دیا جائے گا۔ دو روز سے کارخانہ میں پولیس کے ٹرک کھڑے ہیں۔ اور مزدوروں کو برابر دھمکی دی جا رہی ہے۔ میں اپنے کارخانے کے دوسرے مزدوروں کے ساتھ مل کر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں۔ یا سیٹھ کے تشدد سے مر جاؤں۔ دیکھو، میرے بعد تم ہی ان بچوں کی نگہبان ہو، اگر مجھے کچھ ہو جائے۔ تو تم میری جگہ لے لینا اور گھگھو جب سیانا ہو جائے تو اس سے بتا دینا کہ تمہارا باپ صرف روٹی کپڑے کیلئے نہیں بلکہ اس ملک میں استحصال سے پاک نیا معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد میں شہید ہو گیا۔ گھگھو کو اسی راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے، جس راستے پر میں چل رہا ہوں۔

شعیب آج بے تکان بولے جا رہا تھا۔ درمیان میں اس کی سانس نہیں اُکھڑی، نہ ہی کھانسی کی یلغار میں اس کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا۔ اس نے گھگھو کو اپنے اور قریب کر لیا۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "گھگھو اگر تمہارے باپ کے بس میں بات ہوتی تو وہ دنیا جہان کی خوشیاں تمہاری جھولی میں ڈال دیتا، مگر افسوس تمہارا باپ تم لوگوں کو دُکھ کے سوا کچھ نہ دے سکا۔ یہ ناانصافی صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں ہے، بلکہ تمہاری طرح لاکھوں کروڑوں گھگھو زندگی کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ بیٹے اگر میں مر جاؤں تو بڑا ہو کر میرے کام کو آگے بڑھانا۔ ظلم کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا"

گھگھو بڑے غور سے اپنے بابا کی باتیں سن رہا تھا۔ کچھ باتیں اس کے پلے پڑیں اور کچھ نہ پڑیں، مگر وہ اپنے بابا کے جذبات کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے زور زور سے اپنا سر ہلا کر اقرار کر لیا کہ وہ اُسی راستے پر چلے گا جس راستے پر اس کا بابا چل رہا ہے۔ جدوجہد کی اس روشنی کو وہ کبھی مدھم نہ ہونے دے گا۔ جس میں اس کے باپ کا لہو بھی شامل ہے۔

سیفو نے اپنی میلی ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس بار بھتہ نہیں ملے گا تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ آٹے کا کنستر خالی ہے۔ چاول کا ایک دانہ نہیں ہے۔ جلانے کی لکڑی بھی نہیں ہے۔ تیل اور نمک بھی ختم ہو گیا۔ دوکاندار نے آج صبح ادھار دینا بند کر دیا۔ اس نے کہلوایا ہے پہلے قرض اُتارو پھر اُدھار لے گا۔ گھر کیسے چلے گا۔ آج بچوں کو روٹی بھی نہیں ملی" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گھگھو اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "اماں۔ اری اماں، مت رو، میں آسمان سے گن گن کر بدلہ لوں گا"

شعیب کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "شکر کر سیفو دیکھ تیرا بیٹا کتنا سیانا ہے۔ ایسے گھر کو بھوک کبھی فنا نہیں کر سکتی جس میں گھگھو جیسے بیٹے ہوں" شعیب اُٹھ کر پلنگڑی پر آگیا اور اپنے منہ کو چادر سے ڈھانپتے ہوئے بولا۔ "سیفو ذرا سویرے اٹھا دینا۔ کارخانے میں گڑبڑ ہے، سویرے سویرے جانا ہے"

اس بار ہوا کا جھونکا اتنا تیز آیا کہ دونوں کواڑ دھڑام سے کھل گئے۔ سیفو اپنے خیالوں سے ایک دم چونک پڑی۔ شعیب آگیا۔ لیکن کھلے ہوئے دروازے سے کوئی اندر نہ آیا۔ باہر گلی سنسان پڑی تھی۔ سامنے علی مراد کے گھر کا دروازہ بھی بند تھا، لیکن اندر چراغ جل رہا تھا، جس کی مدھم مدھم روشنی مٹی کی دیوار کی جھری سے باہر آرہی تھی۔ علی مراد کی بیوی بچے شاید جاگ رہے تھے۔ صبح علی مراد اور شعیب دونوں اکٹھے کارخانے گئے تھے۔ سیفو اٹھ کر دروازہ پر کھڑی ہو گئی۔ دور تک گلی ویران پڑی تھی۔ نکڑ پر کمیٹی کا لیمپ جل رہا تھا۔ اس کے نیچے چند کتے بیٹھے تھے۔ ایک کُتے نے کسی کی آہٹ پر اپنے کان کھڑے کر لئے، اور اس نے مغرب کی جانب مُنہ اُٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ ایک سائیکل سوار تیزی سے گزر گیا۔ کُتا کچھ دور تک اس کے تعاقب میں لپکا پھر واپس آکر کمیٹی کے لیمپ کے نیچے بیٹھ گیا۔ شعیب کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ گلی کی ویرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

سیفو نے پریشانی کے عالم میں اپنی ساڑی کے پلو سے چہرے کو صاف کیا اور دروازہ بھیڑ کر دری پر آکر بیٹھ گئی۔ نرجو نے نیند میں کروٹ بدلی اور اس کا ایک ہاتھ تیزی سے گھگھو کے منہ پر پڑا۔ گھگھو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنی ماں کو تکتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کی حالت درست ہوئی تو اس نے اپنی ماں سے پوچھا۔ "بابا نہیں آیا۔؟" "نہیں ابھی تک نہیں آیا۔ جانے آج اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ تو کیوں جاگ گیا۔ سو جا تیرا بابا آتا ہی ہوگا" سیفو نے گھگھو کی ڈھارس بندھائی۔ حالانکہ اس سناٹے میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ گھگھو کے جاگنے سے اُسے بڑی تقویت محسوس ہوئی تھی۔ گھگھو اپنی ماں کی پریشانی بھانپ گیا۔ اس نے بالٹی کے پانی سے اپنے منہ پر چھپا کا مارا اور اپنی ماں کے قریب ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

رات کے دو بج رہے تھے - باہر گلی میں کتے زور زور سے بھونکنے لگے - سیفو نے کہا "شائد گلی میں کوئی آ رہا ہے"۔
"بابا ہوگا" گھگھو نے جواب دیا۔ کتوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی آہٹ تیز ہوگئی۔ بہت سارے ان دیکھے قدموں کی چاپ سیفو کے دل میں اترتی جا رہی تھی - اس بار شعیب ضرور ہوگا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شعیب آگیا۔ قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ اور سیفو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ شعیب اس کی زندگی کی کل کائنات تھا۔ اس کے بچوں کا باپ -

شعیب اس سے بے حد پیار کرتا تھا۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہ کی - اگر وہ کوئی غلطی کرتی تو وہ بڑی نرمی اور ملائمیت سے اُسے سمجھا دیتا۔ وہ اکثر کہتا کہ بیوی سے بدسلوکی کرنے والے مرد نہیں ہوتے - عورت اور مرد گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ دونوں کے حقوق برابر ہوتے ہیں - یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر مرد غلطی کرے تو کوئی نہ پوچھے اور عورت سے معمولی خطا ہو جائے تو اُسے سزا دی جائے - یہ ظالموں کا قانون ہے - میں ایسے قانون کو نہیں مانتا"

قدموں کی آہٹ بہت قریب آگئی تھی - سیفو خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ یہ آہٹ واپس نہ چلی جائے - اس کے دروازے پر رک جائے اور پھر - پھر شعیب کھانستا ہوا گھر میں داخل ہو جائے - شاید اس کی دعا قبول ہوگئی تھی - بہت سارے قدموں کی آہٹ اچانک اس کے گھر کے دروازے کے سامنے تھم گئی - گھگھو تیر کی طرح سنسناتا ہوا دروازہ پر پہنچ گیا - اس کے ساتھ ہی کسی نے زور زور سے کواڑ کو بھڑ بھڑایا - اتنی دیر میں سیفو بھی دروازے پر پہنچ گئی - گھگھو نے جلدی سے کواڑ کھول دیا - سامنے پٹرومکس کی روشنی میں دس پندرہ آدمی کھڑے تھے۔ ان میں گلی کے علی مراد، نثار اور خدا بخش بھی تھے - یہ سب شعیب کے ساتھی تھے، اس کے ساتھ مل میں کام کرتے تھے - علی مُراد کے گھر کا دروازہ بھی کھل گیا تھا - اور اس کی بیوی بچے لالٹین لئے دروازے پر کھڑے تھے - گلی میں اچھی خاصی روشنی ہوگئی تھی - اس روشنی میں سیفو نے دیکھا کہ اس کے دروازے پر ایک چارپائی رکھی ہے - خون میں لت پت چادر کے نیچے ایک آدمی لیٹا ہے - سیفو نے گھبرا کر علی مراد کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں - اس نے گھبرا گھبرا کر ان لوگوں پر نظر ڈالی، جو اس کے گھر کے سامنے کھڑے تھے - ان میں بس ایک شعیب ہی نہیں تھا -

"شعیب کہاں چلا گیا"؟

علی مُراد نے کوئی جواب نہ دیا - اس نے خاموشی سے چارپائی پر لیٹے ہوئے شخص کے چہرے سے چادر ہٹا دی - سیفو نے خون میں ڈوبے ہوئے اس چہرے کو پہچان لیا شعیب تھا - اس کا شوہر، ابدی نیند سو رہا تھا -

آزاد کشمیر نو آبادی کی حیثیت رکھتا ہے

صفحہ ۳ سے آگے

نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کشمیر کی آزادی کے لئے غیر فعال اور مجہول رویہ ترک کر کے بھرپور انداز میں عملی جدوجہد کی راہ اختیار کی جائے۔

۱۲ اگست ۶۵ء کو پشاور میں چاروں افراد جمع ہوئے، اور وہاں این۔ ایل۔ ایف (قومی محاذِ آزادی) کی تشکیل ہوئی۔ یہ کشمیریوں کی طرف سے پہلا ٹھوس قدم تھا۔

۵ اگست ۶۵ء کو قومی محاذِ آزادی نے اپنا کمانڈو دستہ مقبوضہ کشمیر میں بھیج دیا۔ ۶ ستمبر کو بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ صدر آزاد کشمیر کی طرف سے محاذِ رائے شماری کے رہنما، عبدالخالق انصاری کو طلب کیا گیا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ انہیں چند ذمے داریاں سونپی گئیں، جنہیں جنگ کے دوران انکی تنظیم نے پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ نبھایا۔

"اس وقت بھی ہمارا یہ اندازہ تھا کہ یہ جنگ دس پندرہ روز میں ختم ہو جائے گی" جی۔ ایم۔ لون بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ "اس وقت ہمارے بیشتر کارکنوں کا خیال تھا کہ اگر یہ جنگ، عوامی جنگِ آزادی کی شکل میں لڑی جائے گی تو ہم اس سے پورا تعاون کریں گے۔ لیکن یہ جنگ ایوب خان کی مہم بازی ثابت ہوئی"

جنگ شروع ہونے سے پہلے جی۔ ایم۔ لون یورپ میں تھے، جب وہ واپس آئے تو انہیں قومی محاذِ آزادی کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ وہ قومی محاذِ آزادی کے پانچویں رکن تھے۔

بعد میں قومی محاذِ آزادی کے ارکان —— نے فیصلہ کیا کہ چند منتخب افراد کو مقبوضہ کشمیر بھیجا جائے، تاکہ وہ وہاں عوام کو منظم کریں، اور انہیں مسلح جدوجہد کی راہ اختیار کرنے پر ابھاریں۔ قومی محاذِ آزادی کے تحت دو گروپ بنائے گئے۔ آپریشنل گروپ کی قیادت میجر امان اللہ کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ خفیہ طور پر مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں کے CELL بنائیں۔ لیبرن گروپ کے قائد مقبول بٹ تھے، ان کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ کشمیری عوام کو منظم و متحرک کریں۔ اس وقت عام تاثر یہ تھا کہ معاہدہ تاشقند کے بعد کشمیر کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کشمیریوں کے ذہنوں میں تمام شکوک رفع کئے جائیں، اور انہیں آزادی حاصل کرنے کے لئے مادی اور ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔ گزشتہ کمانڈو مہم کی ناکامی کے بعد سیاسی طور پر ایک خلا پیدا ہو گیا تھا، جسے پُر کرنا بہت ضروری تھا۔

مقبول بٹ کو تین ماہ کے بعد رپورٹ دینے کیلئے واپس آنا تھا۔ فضا بہت سازگار تھی، اور وہ وہاں تیزی سے لوگوں کو منظم کر رہے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھارتی فوج کیخلاف لڑتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔ ان کا ایک ساتھی اورنگ زیب شہید ہو گیا۔ ان کے علاوہ ان کے تین سو دوسرے ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس دوران میجر امان اللہ کو دشمن کی سرگرمیوں کا علم ہو چکا تھا، اس لئے وہ روپوش ہو گئے۔

مقبول بٹ سری نگر جیل سے کس طرح فرار ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے۔ جب کبھی حریت پسند کشمیریوں کی تاریخ مرتب کی جائے گی، مقبول بٹ کی یہ ولولہ انگیز روداد جلی قلم سے لکھی جائے گی۔ مقبول بٹ ہفتوں پیدل چلتے رہے۔ راستے میں کشمیری کسانوں نے بڑی محبت سے ان کی آؤ بھگت کی۔ ان کا نام کشمیریوں کے دلوں پر نقش ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ جہاں کہیں جاتے، لوگ انہیں پہچان لیتے۔

کشمیریوں پر جس بے غیرتی اور ڈھٹائی کے ساتھ مظالم ڈھائے جا رہے تھے، ان میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ مقبول بٹ جب آزاد کشمیر پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مقبول بٹ کو بھارت کا جاسوس قرار دے کر انتہائی کمینگی اور بے غیرتی کے ساتھ تاریخ کا مذاق اڑایا گیا۔ قومی محاذِ آزادی کے رکن امان اللہ خان نے پریس کو یہ بیان دیا کہ یہ خالصتاً کشمیریوں کی اپنی تحریک ہے، لیکن اسے نمایاں انداز میں شائع نہیں کیا گیا۔ محاذ کے رہنماؤں نے وزارتِ امورِ کشمیر سے رجوع کیا، ایوانِ صدر میں یادداشت پیش کی، اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب آغا شاہی سے ملاقات کی، لیکن آغا شاہی کے علاوہ انہیں کسی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ وزارت امورِ کشمیر نے تو انہیں طرح طرح سے ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ انہیں دھمکیاں دی گئیں کہ اپنی سرگرمیاں بند کرو، ورنہ تمہارے خلاف "احتسابی" کارروائیاں کی جائیں گی۔ لیکن کج فہموں کو کون سمجھاتا کہ آزادی کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ڈال سکتا۔

اے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے!

"کیا یہ خیال درست ہے کہ کشمیریوں کی طرف سے دنیا کی دوسری تحریکاتِ آزادی کی بھرپور حمایت نہیں کی جاتی؟"

اس سوال کا جواب پہلے میر عبدالمنان اور پھر جی۔ ایم لون نے دیا۔

"کشمیری عوام اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کی تحریک دنیا کی دوسری تحریکوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ ہم نظریاتی طور پر دنیا کے تمام مظلوم عوام کی حمایت کرتے ہیں۔ اسی نکتے کے پیشِ نظر ہم دنیا کی دوسری تحریکاتِ آزادی کے حق میں مظاہرے کرتے رہے ہیں، اور قراردادیں منظور کرتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری ان سرگرمیوں کو اخبارات میں نمایاں مقام نہیں ملتا۔ آزاد کشمیر میں ہم جلسے کرتے ہیں، اور جلوس نکالتے ہیں، ان کی خبریں توڑ مروڑ کر دنیا کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہمیں صرف غلام اقوام اور دنیا کے تیسرے ممالک سے مدد مل سکتی ہے۔ چونکہ ہمارا نصب العین ایک ہے، ہماری جنگ ایک ہے، اس لئے ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے دنیا کے سامنے ہمارا موقف صحیح انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ پاکستانی حکومت اقوام متحدہ میں غیر فعال کردار ادا کرتی رہی ہے۔ اس کے لئے عالمی پیمانے پر تحریک چلانے کی ضرورت تھی، جسے سرے سے نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مسئلے کو کشمیری عوام کے مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جانا چاہیئے تھا۔ اسی غیر فعال

کردار کی بناء پر بہت سے ممالک میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بھارت اور پاکستان کا سرحدی جھگڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب دو قومی نظریہ مسترد ہو چکا ہے۔ دنیا کا دباؤ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس قوت کو پوری طرح استعمال نہیں کیا گیا۔ پاکستان کو چاہیئے کہ وہ اب سینٹو کو خیر باد کہہ کر مظلوم اور ترقی پذیر اقوام کی عدالت میں کشمیر کا مسئلہ پیش کرے۔"

"آپ کی جدوجہد نے اس سے پہلے فیصلہ کن مرحلہ کیوں نہیں اختیار کیا؟"

اس کے جواب میں میر عبدالمنان اور جی۔ ایم۔ لون نے جو اسباب بیان کئے، ان کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی نوکر شاہی نے ہمیشہ بے ایمانی اور دغابازی سے کام لیا ہے۔ اسے کشمیری تحریک سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کی وجہ سے یہ مسئلہ ہمیشہ سرد خانے میں پڑا رہا۔ پاکستان کشمیریوں کے حقِ خود اختیاری کا پرچار تو کرتا تھا، لیکن بھارتی پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے لئے کوئی مؤثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔ ہم سے اس بات کی توقع کی گئی کہ ہم وزارتِ امورِ کشمیر کے کلرکوں کے احکام بجا لاتے رہیں۔

طرفہ تماشا یہ کہ ایک زمانے میں کشمیر کی تقسیم کے امکان پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا۔ ہم نے اس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ ہم کشمیر کی سالمیت کے حامی ہیں اور کبھی اس کا بٹوارہ نہیں ہونے دیں گے۔ اس زمانے میں ایوب خان "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر بھارتی حکومت سے مذاکرات کرنا چاہتا تھا۔ سورن سنگھ اور وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات ناکام ہو گئے۔ یہ مذاکرات ان بنیادوں پر ہوئے تھے کہ "رائے شماری" اور "اٹوٹ انگ" کے درمیان کوئی متبادل راہ اختیار کی جائے۔ اس وقت بھی ہم نے یہ کہا تھا کہ متبادل راہ موجود ہے۔ اور وہ ہے کشمیر کی مکمل اور غیر مشروط آزادی! ہم اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں بہر حال مسلح جدوجہد کی راہ اپنانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے عوام بہت پہلے مسلح جدوجہد شروع کر چکے تھے۔ ہماری جنگ الجیریا کی جنگ سے بھی پرانی ہے۔ ہمارے مزدوروں اور کسانوں نے روایتی ہتھیاروں سے توسیع پسندوں کا مقابلہ کیا تھا، اور ایک بہت بڑا علاقہ آزاد کرا لیا تھا۔ ۵ ء میں غلام نبی گلکار



خواجہ عطاء اللہ

نے مقبوضہ کشمیر میں "آزاد اور خود مختار کشمیر" کے نعرے پر انتخاب لڑا تھا۔ بد قسمتی سے وہ انتخابات میں ہار گئے لیکن اس مثال سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک "آزاد اور خود مختار کشمیر" کا نظریہ کشمیریوں کے ذہنوں میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ اب صورتِ حال ایسی ہے کہ ہمیں "خود مختار کشمیر" کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔"

میری خواہش پر جی۔ ایم۔ لون نے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس مسئلے پر روشنی ڈالی۔ "ہمیں اپنی غلطیوں کا اعتراف ہے۔ شروع میں ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں کسی بھی گروپ کی مخالفت مول نہیں لینی چاہیئے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے، اور اسی راہ پر چلتا رہے گا۔ لیکن ہمارا یہ موقف غلط تھا۔ ہمیں تمام موقع پرستوں کو بے نقاب کرنا چاہیئے۔ شروع میں لوگوں کے ذہن الجھنوں میں مبتلا تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا رخ صحیح نہیں تھا۔"

وطن کی مٹی سے آزادی کی مہک آ رہی ہے

"کیا آپ اس بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ خود مختار کشمیر کا نظام کیسا ہو گا؟"

میر عبدالمنان نے جواب دیا۔ "ہماری پارٹی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ یہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہو گی!"

"لیکن یہ تو بہت تجریدی نعرہ بن چکا ہے۔ ہر شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا تحفظ کرے گا!"

جی۔ ایم۔ لون نے کہا "عوام کا شعور روز بروز بلند ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن اپنا حق لے کر رہیں گے۔ بہت سے ممالک کی مثال ہمارے سامنے ہے۔"

اس جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی، لیکن میں نے اس سوال پر زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔

اب میں ایک بار پھر پوری محویت کے ساتھ گوریلا اغوا کی دلچسپ اور تحیر خیز کہانی سن رہا تھا۔

نومبر ۱۹۶۹ء میں محاذِ رائے شماری کے انتخابات ہوئے، جن میں مقبول بٹ کو صدر، اور میر عبدالمنان کو سکریٹری کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمیں بیرونی امداد کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے، اور اپنے طور پر مسلح جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہیئے۔ ہمارے میر عبدالقیوم تھے۔ ان کی کوششوں سے ۲۷ سرمایہ داروں نے باقاعدگی کے ساتھ ہمیں فنڈ دینا شروع کیا۔ اس سے ہم ہتھیار خرید کر میجر امان اللہ کے پاس مقبوضہ کشمیر بھیجنے لگے۔

دسمبر ۱۹۶۹ء میں ہاشم قریشی اپنی بہن کی شادی میں حصہ لینے کے لئے پاکستان آیا۔ وہ یہاں مقبول بٹ سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ مقبول بٹ مقبوضہ کشمیر میں مقبول تھے۔ بھارتی حکومت نے ان کی گرفتاری پر دس ہزار روپے کا انعام مقرر کیا تھا، اور پناہ دینے والے کیلئے سات سال قید کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ اس لئے ان کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

مقبول بٹ نے ہاشم قریشی کو بم بنانے کا فارمولا دیا اور اسے یہ فرض سونپا کہ وہ واپس جا کر مقبوضہ کشمیر میں خفیہ CELL بنائے۔ ہاشم قریشی نے واپس جا کر حسبِ ہدایت خفیہ CELL قائم کئے۔ اشرف قریشی بھی ایسے ہی سیل کا رکن تھا۔ اس کے بعد ہاشم نے قومی محاذِ آزادی سے مال (ہتھیار) بھیجنے کا تقاضہ کیا۔ اور جب اسے اطمینا

جواب نہیں ملا تو وہ خود کراچی آگیا۔ میر عبد المنان نے اسے کراچی سے پشاور بھیج دیا، جہاں اس کی ملاقات مقبول بٹ سے ہوئی۔ اسی زمانے میں ایک کیوبن نے ایک طیارہ اغوا کیا تھا۔ مقبول بٹ نے اُسے وہ خبر دکھائی۔ ہاشم قریشی کو یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ دونوں اس بات سے متفق تھے کہ اگر کوئی بھارتی طیارہ اغوا کیا جائے، تو اس سے دنیا کو اپنے وجود کا احساس دلایا جاسکتا ہے۔ ہاشم قریشی کو ایک نقشہ دیا گیا، اور ہائی جیکنگ کے اصول سمجھائے گئے۔ اُسے ایک دستی بم دیا گیا، تاکہ وہ بوقتِ ضرورت اس کا استعمال کرسکے۔

ہاشم قریشی جب سیالکوٹ کی سرحد پر پہنچا تو بھارتی پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا۔ اس پر اتنی اذیتیں توڑی گئیں کہ اُسے اپنا اصل منصوبہ بتانے پر مجبور ہونا پڑا۔ بھارتیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اسے "معاف" کردیا اور اُسے ملازمت کی پیشکش کی۔

ہاشم قریشی کو ایئرپورٹ پر متعین کیا گیا، جہاں دو جاسوس ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہاشم چھ ماہ تک وہاں ملازمت کرتا رہا۔ اس نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ اس نے اشرف کے ساتھ مل کر پورا منصوبہ بنالیا۔ اشرف قریشی نے دو ٹکٹ خریدے۔ ایک اس کے نام سے تھا اور دوسرا محمد حسین کے نام سے تھا۔ ہاشم کسی نہ کسی طرح دونوں جاسوسوں کو جھانسا دینے میں کامیاب ہوگیا۔ ۳۱ جنوری کو وہ سری نگر سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جب جموں سے پرواز شروع ہوئی تو انہوں نے ہائی جیکنگ کا اعلان کردیا۔ اشرف ایک اچھا آرٹسٹ ہے، اس نے لکڑی کا ایک نقلی دستی بم بنالیا تھا۔ پستول بھی نقلی تھا۔ اس طرح وہ گنگا کو اغوا کرکے راوی کنارے لے آئے۔

دوسرے دن اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا۔ لاہور ایئرپورٹ پر ہزاروں افراد جمع تھے۔ ہاشم اور اشرف طیارے کے اندر تھے۔ مقامی حکام ان پر ہر طرح سے زور ڈال رہے تھے کہ وہ طیارے کو ان کے حوالے کردیں۔ پھر انہوں نے دھوکے سے تمام مسافروں کو نیچے اتار لیا۔ ہاشم اور اشرف نے جہاز کو تباہ کرنے کی دھمکی دے دی۔ مقامی حکام اور کشمیری رہنماؤں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ کشمیری رہنما اس بات کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے کہ طیارے کو واپس کردیا جائے۔ اشرف اور ہاشم نے یہ کہا کہ اگر مقبول بٹ نے اجازت دے دی تو وہ طیارے کو اقوام متحدہ کے کسی رکن کے حوالے کردیں گے۔

لیکن حکام کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ چیف سکریٹری، حکومتِ پنجاب، میاں افضل نے انتہائی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں صرف مسافروں سے دلچسپی تھی، طیارے سے کوئی واسطہ نہیں۔ مسئلہ کسی طرح حل ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ آخر اشرف اور ہاشم کو ایس پی سردار وکیل نے پٹرول اور ڈی۔ ایس۔ پی باقر علی نے ماچس فراہم کی اور کہا "جلدی سے یہ جھگڑا چکا دو"

اس طرح گنگا جل کر راکھ ہوگیا۔

اس سلسلے میں جی۔ ایم۔ لون نے یہ دلچسپ بات بتائی کہ سردار قیوم نے اشرف اور ہاشم کو یہ پیشکش کی تھی کہ اگر وہ خود کو "المجاہد" تنظیم کا نمائندہ ظاہر کریں تو انہیں آزاد کشمیر میں اکیس توپوں کی سلامی دی جائے گی۔" جی۔ ایم۔ لون نے کہا کہ ہماری نظروں میں سردار قیوم اتنا ہی بڑا مجرم ہے، جتنا کہ یحییٰ خان تھا۔ وہ ہماری تحریکِ آزادی کا سب سے بڑا غدار ہے۔"

ایک سوال کے جواب میں میر عبد المنان نے کہا کہ ہم ہاشم قریشی کی سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر رہے ہیں۔"

"این۔ ایل۔ ایف (قومی محاذِ آزادی) کا آئندہ کیا پروگرام ہے؟"

یہ میرا آخری سوال تھا۔

"ہماری تنظیم مسلح جدوجہد کی راہ پر گامزن رہے گی۔ ہمیں کشمیر کو غلامی سے آزاد کرانا ہے، اُس وقت تک ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قسمت کا فیصلہ آزادانہ ماحول میں ہو۔ جو ہم سے ہمدردی رکھتا ہے، ہم اس کا تعاون چاہتے ہیں۔ ہمارے عملی اقدامات کیا ہوں گے، اس پر فی الوقت روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔ آزاد کشمیر کی موجودہ حکومت کاغذی ہے۔ ہم ایکٹ، ۱۹۷۴ء کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ کیسی حکومت ہے کہ اس کی اسمبلی کو جب چاہے، معطل کیا جاسکتا ہے۔ اسے نوآبادی کی حیثیت حاصل ہے، اور ہم اس کے خلاف جدوجہد کرتے رہیں گے۔ کشمیریوں کا رابطہ وزارتِ خارجہ کے ذریعے ہونا چاہیئے، جب کہ اس سلسلہ میں وزارتِ امورِ کشمیر ہر طرف چھائی نظر آتی ہے۔ ہم آزاد کشمیر کی موجودہ حکومت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمہوری اقدار کا فروغ چاہتے ہیں۔

میرے سوالات ختم ہوچکے تھے، اس کے باوجود ہم بڑی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میر عبد القیوم، جی۔ ایم۔ لون، خواجہ عطاء اللہ، میر عبد المنان اور اشرف قریشی اپنے ناقابلِ تسخیر جذبوں کا اظہار کر رہے تھے۔

اشرف کہہ رہا تھا: "کشمیری عوام ہندوستانی توسیع پسندوں کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے ہیں، لیکن اخبارات اس کی پبلسٹی نہیں کرتے۔ وہاں نوجوان تو خالی پتھروں سے بھارتی پولیس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پریس کے فوٹوگرافروں سے کیمرے تک چھین لئے جاتے ہیں۔"

میر عبد القیوم کہہ رہے تھے: "ہم پر جاسوسی کا الزام لگایا جاتا ہے، جب کہ یہ منصوبہ ہم نے تیار کیا تھا۔ اسے اتنی رازداری میں رکھا گیا تھا کہ خود میرے چھوٹے بھائی کو اس کا اس وقت علم ہوا، جب اس واقعے کی تشہیر اخبارات میں ہوئی۔ وہ این۔ ایل۔ ایف کے رکن نہیں ہیں، اس لئے میں نے پوری رازداری سے کام لیتے ہوئے انہیں کچھ نہیں بتایا۔"

"جی۔ ایم۔ لون کہہ رہے تھے: "ہم نے جو نئی راہ اختیار کی ہے، اُسے کبھی ترک نہیں کریں گے۔"

سیدھے، سچے جذبات تھے، اور انتہائی سادگی کے ساتھ ان کا اظہار کیا جارہا تھا۔ یہ لوگ دو سال تک قید رہے تھے، لیکن ان کی آوازوں میں تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اگر ان کا یہ جذبہ برقرار رہا تو وہ نئے نئے تجربات سے دوچار ہوں گے، اور دھیرے دھیرے ان کی ٹکر آگے بڑھتی رہے گی۔ میں جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔

میں نے انکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، جن پر مظلومیت کے نشان واضح طور پر نظر آرہے تھے، لیکن ان کا عزم کتنا بلند! کتنا محترم تھا۔

انہیں دشمن کا جاسوس ٹھہرایا گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں انکے آگے سر جھکا کر اپنی پوری قوم کی طرف سے شرمساری اظہار کردوں، اور ان کے عظیم جذبوں کو سلام کردوں۔

لیکن مجھے ڈر تھا کہ میری آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو کہیں باہر نہ گر پڑیں!۔

انجمن پنجابی طلبا جامعہ کراچی کی مجلسِ مذاکرہ

ملکی تعمیر میں پنجاب کا کردار

پنجاب تحریک پاکستان کا مضبوط ترین ستون

شتاق احمد شتاق

۲۶ مئی کو "انجمن پنجابی طلبار، جامعہ کراچی" کے زیرِ اہتمام ایک مجلسِ مذاکرہ بعنوان "ملکی تعمیر میں پنجاب کا کردار" منعقد ہوئی۔ انجمن کے نائب صدر ظفر اقبال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی حیثیت ایک خاندان کی سی ہے جس میں پنجاب سب سے بڑا بھائی ہے۔ جو نہ صرف ملک کے لئے اناج پیدا کرتا ہے بلکہ وطن کے دفاع کے لئے بھی سرحدوں کو اپنے جوانوں کے خون سے سیراب کرتا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کی بنجر زمینوں کو آباد کرنے میں پنجابیوں نے عظیم کردار ادا کیا۔ اردو زبان بھی پنجاب کی مرہونِ منت ہے۔

پروفیسر ایم ایل ہمدانی نے پنجاب کے تاریخی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جب سر سیّد نے ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کے لئے تعلیمی ادارے کھولنے کا فیصلہ کیا تو اہلِ پنجاب نے دل کھول کر ان کی مدد کی پنجاب کی عورتوں نے اپنے زیورات تک یونیورسٹی فنڈ میں دیئے۔ پھر یو۔ پی کے گریجویٹوں کو پنجاب میں ملازمتیں دیں۔ بنگال کے ساتھ ہی پنجاب میں بھی مسلم لیگ قائم کی گئی۔ پاکستان کا تصور اور نام پیش کرنے والے دونوں کا تعلق صوبہ پنجاب سے تھا۔ قرار داد پاکستان بھی لاہور میں ہی پیش کی گئی۔ دوسرے لفظوں میں پنجاب تحریک پاکستان کا ایک مضبوط ترین ستون تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت پنجاب کے لوگوں نے جانی و مالی قربانیاں دیں۔ دوسرے صوبوں کی ترقی کے لئے پنجاب نے اپنی آبادی سے کم نمائندگی قبول کی۔ اور اُن کی مالی امداد بھی کی۔ پنجاب کی اپنی ترقی کا یہ عالم ہے کہ اس کی ذرخیز زمینوں کے لئے جو بند بھی بنائے گئے۔ وہ تمام دوسرے صوبوں میں ہیں۔ اتنی قربانیوں کے باوجود یہ گلہ ہے کہ ہم وفادار نہیں

جناب رئیس امروہوی نے کہا کہ میں یہاں تقریر کرنے نہیں بلکہ پنجاب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے آیا ہوں۔ پنجاب کا کردار ایک تاریخی حقیقت ہے۔ نظریہ پاکستان پنجاب نے پیش کیا اور وہی اس کی حفاظت میں پیش پیش رہا ہے۔ بلکہ پاکستان کا نام ہی پنجاب ہے انہوں نے مطالبہ کیا کہ جن شعبہ حیات میں پنجابیوں کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا فوراً ازالہ کیا جائے۔ پنجاب کی ترقی پاکستان کی ترقی ہے انہوں نے واضح کیا کہ پنجاب کے امیج کو دشمن کے ایجنٹ خراب کر رہے ہیں تاکہ ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کیا جا سکے۔ جناب رئیس امروہوی نے مطالبہ کیا کہ جن زمینوں کو پنجاب کے غریب کسانوں نے اپنے خون پسینہ سے سیراب کر کے کاشت کے قابل بنایا تھا۔ اس سے بیدخلی سراسر بے انصافی ہے۔

جناب ایم۔ اے۔ طور صدر پنجابی سوسائٹی نے کہا! پنجاب ہمیشہ محبت و اخوت اور ایک اچھے سیاسی وفاق کے لئے کوشاں رہا ہے۔ اردو کے سلسلے میں پنجاب کی خدمات عظیم ہیں۔ تقسیم کے بعد پنجاب نے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کو فراخدلی سے قبول کیا۔ اور دوسرے صوبوں کی مسلسل مالی امداد کر رہا ہے۔ پنجاب کے کردار کا یہ زندہ ثبوت ہے کہ اس نے ملک کی سالمیت کے تحفظ کے لئے اپنا تن، من اور دھن سب ملک پر نچھاور کر دیا۔ بھارتی جارحیت کے مقابلے میں پنجابی جوانوں نے ہمیشہ سینہ سپر ہو کر سرحدوں کی حفاظت کی۔ آج بھی بھارتی قید میں ہمارے بھائی اپنی رہائی کے لئے ملک کی ناموس کا سودا کرنے پر تیار نہیں۔ پنجاب نے ہمیشہ اپنے منہ کا نوالہ دوسروں کو دیا پھر بھی کہا جاتا ہے کہ پنجاب نے دوسروں کو لوٹا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنجاب ایک خوشحال علاقہ ہے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ میں نے وہ چیز اور زندگی کی وہ رُوح اب وہاں نہیں دیکھی جو کبھی پہلے پنجاب کی علامت ہوا کرتی تھی۔ آج پنجاب مفلسی ناداری اور بے بسی کا شکار ہے۔

مہمانِ خصوصی مخدوم زادہ حسن محمود نے کہا کہ کسی تحریک کے تین اہم کردار ہوا کرتے ہیں۔ طلباء، شاعر اور وکلاء۔ پنجاب کے طلبہ، شاعروں اور وکلاء نے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے سلسلے میں عظیم قربانیاں دی ہیں۔ پنجاب دوسرے صوبوں کا بڑا بھائی ہے۔ اور بڑے بھائی کے موثر کردار کے لئے

چھوٹے صوبوں کو اسے تمام شعبہ جات میں پوری نمائندگی دینی چاہیئے۔ پنجاب کے شیروں نے ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا ہے۔ ایک مضبوط اور خوشحال پنجاب پاکستان کے لئے فائدہ مند ہی ثابت ہو گا۔

مذاکرہ میں جناب احمد الطاف اور طالبعلم لیڈر محمد حنیف نے بھی حصہ لیا، اور پنجاب کے کردار کی عظمت پر روشنی ڈالی۔

آخر میں انجمن پنجابی طلبہ کے مشیرِ خاص ڈاکٹر منیر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اعلان کیا کہ آئندہ انجمن کی طرف سے ملکی تعمیر میں دوسرے صوبوں کے کردار کا بھی جائزہ لینے کے لئے مذاکرے کرائے جائیں گے۔

بقیہ:- اظہار خیال

اس کے بعد سب سے بڑی مصیبت اس وقت نازل ہوئی جب انہی نوجوان دانشوروں نے ایشین فاونڈیشن بلکہ امریکی سی آئی اے کی مدد سے چلنے والی ٹریڈ یونین تنظیم میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ میں اس دور میں تقسیم کے بعد سندھ کی سب سے پہلی ٹریڈ یونین تنظیم سندھ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کا جنرل سیکرٹری تھا اور میر رسول بخش تالپور صدر تھے۔ جب مجھے اپنے ساتھیوں کے اس فیصلے کی اطلاع ملی تو میں نے ٹریڈ یونین تحریک سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری توقعات کے عین مطابق تھا پاکستان کے مزدوروں میں انتشار پھیلانے کیلئے پہلے روس اور چین کے نام پر دھڑے بندی کرائی گئی، اس کے بعد دھڑوں کے اندر دھڑے پیدا کئے گئے جس کے نتیجہ میں آج غالباً ایک سو سے زائد فیڈریشن قائم ہیں۔ اور "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ" کا نعرہ لگانے والے آج اس وطنِ عزیز میں مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہونے دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے درمیان لیڈر شپ

کا جھگڑا ہے یا وہ روس نواز یا چین نواز ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ روس اور چین دونوں ہی سوشلسٹ ملک ہیں۔ اور دونوں ہی کسی ملک میں مزدوروں، کسانوں اور عوام کو دھڑوں میں بانٹنے کی حمایت نہیں کر سکتے کیونکہ انہوں نے خود اپنے اپنے ملکوں میں مزدوروں، کسانوں اور عوام کو متحد کر کے استحصالی طبقوں سے نجات حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے سامنے کوریا اور ویت نام کی مثال موجود ہے جہاں کے عوام آج تک روسی اور چینی دھڑوں میں تقسیم نہیں ہو سکے ہیں۔

ہمارے ملک کی بھی حالت ایسی ہی ہے جو سامراجی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے جہاں آج بھی جاگیرداروں نوابوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے باپ دادا کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں یعنی ان کے باپ دادا برطانوی سامراج کے نمک خوار اور وفادار تھے۔ اسی وفاداری کے صِلے میں انہیں جاگیریں اور نوابیاں عطا کی گئی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں برطانیہ نے امریکی ڈالروں کے عوض بہت کچھ اس کے حوالے کیا ہے۔ ہم غلاموں کی سرپرستی کا فرض بھی اسے سونپا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں دو میں ایک راستہ منتخب کرنا ہو گا ایک عوام کو ٹکڑوں میں بانٹنے کا راستہ ہے دوسری عوام کو متحد کر کے غلامی کے بندھنوں کو توڑنے کی راہ ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام میں افتراق، انتشار پھیلانے کا کام صرف سامراج جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے "برگزیدہ بندے" ہی کر سکتے ہیں۔

اس طرح پاکستان میں مزدور طبقہ نے جو تجربات حاصل کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ مزدور طبقہ بغیر کسانوں اور غریب اور متوسط طبقہ کے شہریوں کی مدد کے نہ صرف یہ کہ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا بلکہ اپنی روٹی اور روزگار کی لڑائی بھی کامیابی سے نہیں لڑ سکتا۔ کیونکہ کسان مزدوروں کی جدوجہد میں سب سے قابلِ اعتماد ساتھی ہے۔ دوسرے یہ کہ مزدور طبقہ کو غریب اور متوسط طبقہ سے اپنے تعلقات استوار کرنے کیلئے

کثیر الطبقاتی سیاسی تنظیموں میں کام کرنا ہو گا۔ اور اپنی جدوجہد میں ایسے سیاسی جماعتوں میں شامل مختلف طبقوں کی حمایت حاصل کرنا ہو گی۔ تیسری بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مزدور طبقہ نے اپنے تجربات سے یہ سیکھا ہے کہ اس ملک سے جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور اقتصادی غلامی کا بندھن توڑے بغیر کوئی سوشلزم نہیں آ سکتا ہے۔ اور جو بھی اس کے بغیر سوشلزم لانے کا دعویدار ہے وہ یا تو احمق ہے یا دھوکہ دے رہا ہے۔ سامراجی اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے لئے مزدور طبقہ کو اس ملک میں اپنی جمہوری تنظیموں کے ذریعہ مفاد پرست اور پھوٹ پرست لیڈروں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا۔ اور کسانوں کی جمہوری تنظیموں کے قیام میں مدد دینی ہو گی۔

بقیہ:- عثمان بلوچ کا انٹرویو

ہے۔ اس جگہ میں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مزدور اتحاد سے مراد صرف صنعتی مزدوروں کا اتحاد نہیں ہے۔ بلکہ تمام مظلوم طبقات کا اتحاد ہے، جس میں مزدور، کسان، چھوٹے دکاندار، چھوٹے درجہ کے نوکر پیشہ، ملازم پیشہ، طلباء اور درمیانے طبقے شامل ہیں۔

مزدور اتحاد، مزدور تنظیموں کے اتحاد کے ہم معنیٰ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور تنظیموں کی سیاست ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بعض کے مقاصد بھی مختلف ہیں۔ کچھ مزدور تنظیمیں استحصالی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتی ہیں۔ اور بعض بورژوا ٹریڈ یونین ازم کی حامی ہیں۔ ان حالات میں اگر مزدور تنظیموں کے اتحاد "مزدور اتحاد" کہا جائے تو یہ سراسر اس لفظ کے ساتھ ناانصافی ہوگی، جبکہ "مزدور اتحاد" نہایت اعلیٰ اور ارفع شے ہے۔

ہم کوشش کرتے ہیں کہ مزدوروں کے مسائل حل کرانے کے لئے دوسری مزدور تنظیموں کے ساتھ رہیں تاکہ جدوجہد اور عمل کے دوران مزدوروں کو پرکھنے کا موقع ملے کہ کون کتنا مخلص ہے، اسکے علاوہ اپنے خول میں بیٹھ کر اتحاد کی بات نہیں کی جا سکتی

بقیہ: افسانہ

اتنی دیر میں پوری گلی جاگ گئی، مزدور بستی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک شور مچ گیا "شعیب کی لاش آئی ہے۔ شعیب پولیس کی گولی سے شہید ہو گیا"۔
گھگھو بین کرتی ہوئی ماں کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، لیکن وہ اپنی ماں کو دلاسہ بھی دیئے جا رہا تھا۔ گھگھو اپنے بابا کی باتیں سن سن کر وقت سے پہلے سیانا ہو گیا تھا۔ اس نے تاریک اور وسیع آسمان کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "ماں، ماں تو مت رو، میں اپنے بابا کا انتقام ضرور لوں گا"۔

الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بحال کیا جائے۔ صفحہ ۲ سے آگے

انہوں نے الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کرنے پر تشویش کا اظہار کیا انہوں کہا کہ واحد پرچہ رہ گیا تھا، جو محنت کشوں کی ہمدردی میں بہت کچھ لکھتا تھا اور حکومت کی غلط پالیسی کی نشاندہی کرتا تھا۔ الفتح کے کاغذ پر پابندی آزادی صحافت اور جمہوری قدروں کی پامالی ہے۔ ہم حکومت سے احتجاج کرتے ہیں اور کوٹہ کی بحالی کی اپیل کرتے ہیں۔

۳۰ مئی کو اعلان میں جو خبر چھپی ہے کہ پائنیر کے تمام مقدمے خارج ہو گئے، ہم اس کی تردید کرتے ہیں۔

حکومت نے ہفت روزہ الفتح (حق کی آواز) کا باقی ماندہ ۲۵ فیصد کوٹہ بھی بند کر دیا ہے۔ میں اس کی پُرزور الفاظ میں مذمت کرتا ہوں۔ اس آمرانہ اقدام نے حکومت کی نام نہاد آزادی صحافت کا پردہ بھی چاک کر دیا۔ اور یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ موجودہ حکومت بھی حقائق کا سامنا کرنے سے کتراتی ہے۔

جوپیٹر ٹیکسٹائل ملز
انتظامیہ کی مزدور دشمنی

متحدہ مزدور فیڈریشن حیدرآباد کے جنرل سیکرٹری محمد نقی نے ایک اخباری بیان میں سینڈوز پاک جام شورو اور جوپیٹر ٹیکسٹائل ملز حیدرآباد کی انتظامیہ کے رویہ کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ سینڈوز پاک کے مزدوروں نے تقریباً تین ماہ پہلے انتظامیہ کو اپنے مطالبات پیش کئے تھے لیکن انتظامیہ نے انہیں تسلیم نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے مزدوروں کو مجبوراً ۲۵ مئی ۷۳ء کو ہڑتال پر جانے کا اعلان کرنا پڑا۔

جوپیٹر ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے تقریباً ایک ماہ قبل اپنے مطالبات انتظامیہ کو پیش کئے ہیں لیکن انتظامیہ کی جانب سے ابھی تک گفت و شنید کا سلسلہ شروع نہیں کیا گیا۔ بیان میں سینڈوز پاک جام شورو انڈس گیس کمپنی اور جوپیٹر ٹیکسٹائل ملز حیدرآباد کے مزدوروں کو متحدہ مزدور فیڈریشن حیدرآباد سے ملحقہ تمام یونینوں کی جانب سے مکمل حمایت کا یقین دلایا گیا ہے۔

موجودہ صدر پاکستان بخوبی جانتے ہیں کہ یہ الفتح ہی تھا جس نے پیپلز پارٹی کو عوام تک پہنچانے میں اپنی تمام تر توانائی صرف کر دی۔ کیونکہ پیپلز پارٹی کا منشور سوشلسٹ پروگرام پر مبنی تھا۔ لیکن جب پیپلز پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اپنے پروگرام سے انحراف کرنا شروع کیا، تو یہ الفتح ہی تھا جس نے سب سے پہلے پیپلز پارٹی کے طبقاتی کردار کے بارے میں لکھا۔ میں "الفتح" کے کارکنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کے مظلوم عوام ہر مرحلے میں ان کا ساتھ دیں گے۔ (ممتاز احمد ہاشمی)

صدرِ مملکت نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ ان کی حکومت اخبارات کی جائز تنقید اور آزادیٔ صحافت کی راہ میں حائل نہیں ہوگی۔ لیکن ہفتہ وار الفتح کراچی کا نیوز پرنٹ کوٹہ منسوخ کرنیوالی وزارت نے نہ صرف حکومت کا مذاق اڑایا ہے بلکہ آزادیٔ صحافت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ الفتح کے قارئین اور خود صدرِ مملکت بخوبی واقف ہیں کہ الفتح کے ادارتی نوٹ اور دوسرے مضامین مہذب اور جائز تنقید کی بنیاد پر لکھے جاتے رہے ہیں۔

"الفتح" مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور دوسرے محنت کش طبقوں جن کو سرمایہ داروں جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے کچل رکھا ہے، ان کا بیباک ترجمان ہے۔ لہٰذا اس کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری محنت کشوں پر عائد ہوتی ہے۔ مزدور دشمن وزارتِ اطلاعات و نشریات سے اپیل کرنا کہ وہ الفتح کا نیوز پرنٹ کوٹہ بحال کر دے عبث ہے۔

(شہنشاہ حسن۔ جنرل سیکرٹری ایم۔ ایم اصفہانی ایمپلائز یونین)

ساؤتھ برٹش ایمپلائز یونین کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا، جس میں پاکستان انشورنش ایمپلائز یونین کی پریس کانفرنس پر شکریہ ادا کیا گیا اور تمام محبِ وطن افراد سے ساؤتھ برٹش انشورنش کمپنی کے ملازمین کی حمایت کی درخواست کی گئی۔

ایک قرارداد میں الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کرنے پر افسوس کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ واحد رسالہ تھا جو محنت کشوں کی خبریں اور پروگرام شائع کرتا تھا، اور ان کی جدوجہد کی حمایت کرتا تھا۔ لہٰذا ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ فوری طور پر الفتح پر عائد کردہ معاشی پابندیاں ختم کی جائیں اور اس کا کوٹہ بحال کیا جائے۔

(جنرل سیکرٹری ساؤتھ برٹش ایمپلائز یونین)

انڈس انشورنش ایمپلائز یونین نے اپنے ایک بیان میں الفتح کو نیوز پرنٹ کا کوٹہ اور اشتہارات بند کرنے کے اقدام کی شدید مذمت کی ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ ہفت روزہ الفتح نے ہمیشہ عوام اور سماج کے مظلوم طبقہ کی آواز بلند کی ہے حکومت کا یہ اقدام عوام دشمنی ہے۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ اور اشتہارات پر سے پابندی فوری طور پر ختم کر دے۔

پاکستان پیپلز پارٹی حلقہ گولیمار کے صدر سید شجاع الحسن نقوی اور جنرل سیکرٹری غوری اور نائب صدر نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں الفتح کا نیوز پرنٹ کوٹہ بند کرنے پر حکومت کی شدید مذمت کی ہے۔ انہوں نے کہا، یہ واحد رسالہ ہے، جس نے عوام دوستی اور محنت کش عوام کی حمایت میں موثر کردار ادا کیا اور حکومت کی غیر مناسب پالیسیوں پر تنقید کی۔ ہر محبِ وطن شہری کا فرض ہے کہ وہ برائیوں کا پردہ چاک کرے۔ جس کی سزا الفتح کو حکومت نے کوٹہ بند کر کے دی۔ یہ سراسر غیر جمہوری اقدام ہے۔ اس کا مطلب عوام کی اور محنت کشوں کی آواز پر پابندی لگانا اور آزادیٔ صحافت کا گلا دبانا ہے۔

ہم محبِ وطن شہریوں سے خصوصاً صحافیوں سے درخواست کریں گے کہ وہ اس غیر جمہوری اقدام کی کھلم کھلا مخالفت کریں، اور الفتح کا کوٹہ [illegible] حکومت سے درخواست کرتے ہیں، [illegible] کرتے ہیں اور احتجاج کرتے ہیں کہ وہ الفتح کا کوٹہ بحال کرے۔

سماجی کارکن [illegible] یوسف زئی نے مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات [illegible] سے اپیل کی ہے کہ ہفت روزہ الفتح [illegible] کیا جائے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
7-14 JUNE - 1973



جی ہاں

یہی تو وہ نشان ہے جو چھوٹے کنبے کی نشاندہی کرتا ہے

جہاں یہ نشان ہے وہاں
آپ کی خدمت کا سامان ہے
اپنے قریبی مرکز سے رجوع کریں!

پاپولیشن پلاننگ پروگرام

ORIENT